Phone 80800

قرآنی نظامِ رُبوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1965

تحفظ خویش

و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخیل ترهبون به عدو الله و عدوکم و آخرین من دونهم لا تعلمونهم الله یعلمهم و ما تنفقوا من شئی فی سبیل الله یوف الیکم و انتم لا تظلمون ۔ (۶۰ : ۸)

تم دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو ۔ امکان بھر سامان حفاظت فراہم کرو ۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو ۔ تا کہ تم ان کے ذریعے ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہارے بھی دشمن ہیں اور نظام خداوندی کے بھی دشمن ۔ اور ان کے علاوہ انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا ابھی تمہیں علم نہیں ہوا ۔ اللہ کو ان کا علم ہے ۔ ان انتظامات کے لئے روپے کی بھی ضرورت ہوگی ۔ سو تم سمجھ لو کہ تم خدا کی راہ میں جو کچھ بھی صرف کرو گے وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا ۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی ۔ (ملک محفوظ رہا تو سب کچھ مل گیا) ۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پ

الحـ

وُہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصوّر سامنے آجاتا ہے

لغاتُ القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ نئے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے **مکمل سیٹ** کی رعایتی قیمت **پچاس** روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیب ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کردے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظامِ ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کرسکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دُعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برقِ طور — صاحبِ ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہیئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوتے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام

مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

...ُی — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اُردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع ...باب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

...دارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون (۸۰۸۰۰)
سالانہ پاک و ہند سے دس روپے	پاک و ہند سے	خط و کتابت کا پتہ
سالانہ غیر ممالک سے ایک پونڈ	ایک روپیہ	ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۸ — اکتوبر ۱۹۶۵ء — نمبر ۱۰

فہرست مضامین

لمعات	۲
زندہ باد! شاہین بچگان پاکستان زندہ باد	۱۶
۱۱ ستمبر کی یاد میں	۱۷
کشمیر — اقبالؒ کی نظر میں	۲۶
بچوں کا صفحہ	۳۰
جوشش کردار	۳۲
ہماری تاریخ — (مودودی صاحب سے چند سوالات)	۳۳
احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت — (مولانا محمد تقی صاحب امینی علی گڑھ)	۴۹
مسئلہ حفاظت فروج اور نیاز فتحپوری — (محترم محمد نیاز صاحب)	۶۵
طلوع اسلام کنونشن	۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعم باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس کا عزم کر لے کہ جو آنکھ اس کی طرف بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائیگی خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہیئے جو ابدالی کی تلوار نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھئے! اگر ہندو کو ایک بار شکست مل گئی تو پھر وہ خود بھی امن سے رہے گا اور دنیا کا امن بھی بحال ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں گے۔

(طلوع اسلام۔ بابت جولائی ۱۹۴۸ء)

افراد ہوں یا اقوام، ان میں باہمی اختلافات اور تنازعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ شریف انسانوں کا کام یہ ہے کہ جب کوئی متنازعہ فیہ معاملہ قاعدے اور قانون کے مطابق طے ہو جائے تو اسے تسلیم کر لیا جائے، خواہ وہ فیصلہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن کم ظرف انسانوں میں اتنی وسعتِ قلب اور کشادگیٔ نگاہ نہیں ہوتی۔ وہ بظاہر اس فیصلے پر رضامند ہو جاتے ہیں لیکن اپنے دل میں اس کے خلاف گرہ بٹھائے رکھتے ہیں۔ وہ اسے اپنے پندار کی شکست سمجھتے ہیں اور اس کا بدلہ لینے کے لئے، اپنے اندر بغض و نفرت اور حسد و انتقام کی آگ سلگائے رکھتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ

وہ اس کے بعد، نہ خود ہی امن اور چین سے بیٹھتے ہیں، اور نہ ہی فریق مقابل کو اطمینان سے بیٹھنے دیتے ہیں۔ اور اگر کبھی خدانکردہ، ایسے فرد یا قوم کے دماغ میں یہ خناس سما جائے کہ فریق مقابل کمزور ہے، تو پھر ان کے اودھم کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ان حربوں پر اتر آتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے "اسفل السافلین" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی سفاہت و دنائت کی پست ترین سطح۔

تقسیم ہند کا مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مابہ النزاع تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ برسوں کی آویزش و مناقشت کے بعد، یہ مسئلہ باہمی رضامندی سے طے پا گیا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب معاملہ کا تصفیہ ہو گیا تو پھر جھگڑے اور تنازع کا سوال کیا؟ لیکن ہندو کی کم ظرفی نے اسے اپنی شکست پندار پر محمول کیا، اور تقسیم ہند کو دل سے قطعاً نہ اپنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے لئے جس قسم کی بلند نگہی اور وسعت قلبی کی ضرورت ہوتی ہے، ہندو کو وہ نصیب ہی نہیں۔ گذشتہ ہزار سال کی تاریخ میں اسے ہر مقام پر جو شکستیں برداشت کرنی اور ذلتیں اٹھانی پڑی ہیں، اس سے اس قوم کے تحت الشعور میں، عجیب انداز کی نفسیاتی پیچیدگیاں (PSYCHOLOGICAL COMPLEXES) پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جونہی کوئی فیصلہ ان کی منشاء کے خلاف ہوتا ہے، وہ اسے اپنی ذلت پر محمول کر لیتے ہیں — اور اگر بدقسمتی سے، ان کا فریق مقابل مسلمان ہو، تو پھر ان کی جھنجلاہٹ کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔ محمد بن قاسم۔ محمود غزنوی۔ بابر۔ ابدالی وغیرہ کے تصوراتی بھوت ان کے اعصاب پر ازسرنو سوار ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے چرکے، پھر سے تازہ زخم بن جاتے ہیں اور وہ ان تمام شکستوں اور ذلتوں کا انتقام، اس حریف تازہ سے لینا چاہتے ہیں۔

ہندو صدیوں سے اس نفسیاتی مرض، ذہنی کوفت اور قلبی سوزش میں مبتلا ہے۔ وہ جب تک محکوم رہا، مسلمانوں کے خلاف اپنے پوشیدہ جذبات حسد و منافرت کا مظاہرہ، چھوت کے رنگ میں کرتا رہا۔ مسلمانوں سے چھوت کے پیچھے جذبہ ہی یہ کارفرما تھا کہ وہ انہیں قابل نفرت سمجھتا تھا اور اس احساس میں اپنی آتش انتقام کی تسکین کا سامان پاتا تھا۔ لیکن پاکستانی مسلمانوں ہی کی نہیں، دنیا کی ہر امن پسند قوم کی بدقسمتی کہ اس ذہنیت کی حامل، نفسیاتی مریض قوم کو بیٹھے بٹھائے اتنے بڑے وسیع ملک کی حکومت مل گئی۔ حکومت ملنے کے ساتھ ہی اس نے دھلی۔ گوالیار۔ مشرقی پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں کے نہتے اور کمزور مسلمانوں پر جو قیامت خیز مظالم ڈھائے۔ پھر، جوناگڑھ۔ حیدرآباد اور کشمیر کے معاملہ میں جو کچھ کیا، وہ ان کے اسی نفسیاتی جنون کے مظاہرے تھے۔ آزادی ملنے کے ایک سال کے اندر اندر، اس نے وحشت و بربریت کے وہ عالم سوز مظاہرے کئے کہ ہم جولائی ۱۹۴۸ء میں، وہ کچھ لکھنے پر مجبور ہو گئے جس کا اقتباس سرعنوان دیا گیا

ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، اس نے اہلِ پاکستان کو ایک رات بھی تو چین کی نیند نہیں سونے دیا۔ عیاری۔ مکاری، فریب دہی۔ وعدہ فراموشی۔ عہد شکنی کی آتشِ خاموش سے لے کر قزاقی۔ سفاکی۔ خوں ریزی۔ غارت گری کی شعلہ زنگی تک، کونسا حربہ تھا جو اس نے مسلمانوں کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ دنیا دور سے، زیادہ سے زیادہ ان شعلوں کے دھوئیں ہی کو دیکھ سکتی ہے۔ اسے اس کا صحیح احساس ہو نہیں سکتا کہ ہمیں واسطہ کس قوم سے پڑا ہے!

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

اٹھارہ برس تک ہم اسے برداشت کرتے رہے۔ ہمارا مقدمہ اس "عدالت" (یو۔ این) میں تھا جس کے متعلق "مہذب اقوام" ہمیں دلاسا دلاتی رہیں کہ وہاں سے انصاف مل جانے کی توقع ہے۔ ہم اس فریب میں رہے ــــ یا یوں کہیے کہ خود ہمارے اربابِ اقتدار میں اس کی ہمت اور حوصلہ نہ تھا کہ وہ فریب کے پردے کو چاک کر کے حقائق کا سامنا کرتے۔ اسباب اس کے کچھ بھی تھے، نتیجہ بہر حال یہ تھا کہ ہندو سر پر چڑھتا چلا گیا تا آنکہ فطرت کی کرم گستری سے، پاکستان کی زمامِ اقتدار ایک ایسے مردِ آہن گداز (فیلڈ مارشل محمد ایوب خان) کے ہاتھ میں آ گئی جو بساطِ سیاست اور میدانِ کارزار دونوں پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ انہوں نے بھی امکان بھر کوشش کی کہ ہندوستان کے ساتھ متنازعہ فیہ معاملات کا حل پر امن طریقوں سے ہو جائے لیکن جو قوم دوسروں کی شرافت کو اس کی کمزوری پر محمول کرے، وہ پر امن کوششوں کا احترام کس طرح کر سکتی ہے؟ ادھر سے آئین و ضوابط اور عہد و معاہدات کی پابندی ہوتی رہی، اور اُدھر سے اندر ہی اندر جنگی تیاریوں پر زور دیا جاتا رہا۔ تا آنکہ انہوں نے پیش قدمی کر کے، پاکستانی چوکیوں پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہ درحقیقت، مقیاس (FEELER) تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ جنگ کے تصور کے خلاف پاکستان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے!

اب وہ مقام آ گیا جو قوموں کی تاریخ میں موت اور زندگی کا فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ ہندوستان، اپنے رقبہ، آبادی، اور وسائل کے اعتبار سے پاکستان کے مقابلہ میں کتنے گنا بڑا۔ اس کی فوج (مسٹر میکنامارا کے تخمینہ کے مطابق) پاکستان کی فوج سے پانچ گنا زیادہ۔ اس کا سامانِ حرب و ضرب، جو اس نے چین کے ہوا کی آڑ میں، مختلف گوشوں سے ہتھیا رکھا ہے، بے حد و شمار۔ دنیا کی عظیم طاقتیں اس کی پشت پناہ۔ یہ تمام حالات ایسے تھے جو ایک عام سطح کے انسان کو تھر تھرا دینے اور ہندوستان کے سامنے جھکا دینے کے لئے کافی تھے۔ "دو اور دو چار" کی منطق کا تقاضا یہی تھا کہ ہندوستان کے اس چیلنج کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن غیرت اور حمیت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ یہ تقاضا پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں، اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

یہ وہ مقام تھا جس کے لئے قرآن نے کہا تھا کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲)۔ خدا نے موت اور حیوٰۃ کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ تمہارے لئے اس بات کا موقعہ بہم پہنچائے کہ تم اپنی مضمر قوتوں اور زندہ رہنے کی صلاحیتوں کو آزما سکو، اور اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو کہ

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

یہ وہ مقام تھا جس کے لئے اعلان کیا گیا تھا کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہے اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو۔ قرآن کریم کی رو سے زندگی محض نفس شماری کا نام نہیں، نہ ہی موت سے مراد سانس کی آمد و رفت کا بند ہو جانا ہے۔ اس کے نزدیک، مرگِ باشرف کا نام اصل حیات ہے، اور حیاتِ بے شرف، موت۔ وہ، عزت کی موت مرنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہیں مردہ مت سمجھو، وہ زندہ ہیں۔ (۲/۱۵۴)۔ وہ ذلت کی زندگی جینے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷)۔ وہ ایسی زندگی جیتے ہیں کہ جس میں، ہر آن، موت، اپنے خونی پنجے نکالے، چاروں طرف سے ان کی طرف یلغار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ عذاب ایسا دائمی ہوتا ہے کہ وہ مرتے بھی نہیں کہ اسی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔

یہ دونوں گوشے، صدر مملکت کے سامنے تھے — ایک طرف بے پناہ مشقتیں، مصیبتیں، تکلیفیں، اَلْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (۲/۱۵۵)۔ ہر قسم کے خطرات بھوک پیاس۔ جان۔ مال۔ ثمرات کی تباہیاں تھیں، اور دوسری طرف، غلامی، محکومی، ذلت اور مسکنت کی زندگی — اور غلامی و محکومی بھی ہندو جیسی قوم کی — یہ دونوں گوشے اس کے سامنے تھے، اور وہ ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا — کتنا نازک تھا یہ مقام، اور کیسا مشکل تھا یہ فیصلہ — وہ فیصلہ جس پر دس کروڑ انسانوں کی موت اور حیات، ان کی آنے والی نسلوں کی قسمت، بلکہ اس خطۂ زمین میں خود اسلام کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔ وہ اس گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھا تھا کہ ایک طرف سے یہ ندائے جمال اس کے کانوں میں آئی کہ مُوْتُوْا۔ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (۲/۲۴۳)۔ تم موت کو ترجیح دو، ہم تمہیں زندگی عطا کر دیں گے۔ اس نے آنکھیں اوپر کو اٹھائیں تو سامنے نور کی شعاعوں سے لکھا دیکھا کہ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۹)۔ مت گھبراؤ۔ مت خوف

کھاؤ۔ چونکہ تم کمزوروں اور مظلوموں کو امن کی ضمانت دینے کے لئے اٹھو گے اس لئے تم یقیناً غالب رہو گے۔[1]

اس نشید حیات آور نے کشمکش کو یکسو کر دیا ـــ عشق کی اک جست نے طے کر دیئے قصے تمام ـــ اور اس صاحب عزم و ہمت نے، کامل اعتماد اور یقین کے ساتھ، فریق مخالف سے پکار کر کہہ دیا کہ

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

پاکستان نے بالآخر، ہندوستان کا چیلنج قبول کر لیا۔

پانچ ستمبر کی رات کو ہم سوئے تو یہ رونا روتے ہوئے کہ قوم کی اخلاقی حالت بےحد بگڑ چکی ہے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے ذاتی مفاد کی پڑی ہے۔ قوم اور ملک کے اجتماعی مفاد کا کسی کو خیال نہیں رہتا کہ عام پھیلائے ہوئے خیالات کے مطابق) ہماری فوج بھی سہل انگار اور عیش پرست ہو گئی ہے۔ ایسے میں اگر (خدانخواستہ) ملک پہ کوئی آفت آ گئی تو اس کا کیا بنے گا!

پانچ ستمبر کی رات کو ہم یہ خیالات لے کر سوئے۔ اور جب چھ ستمبر کی صبح کو اٹھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کسی اور ہی ملک کے اندر، ایک اور ہی قوم کے فرد ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں، جب کسی نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ امرتسر کی طرف سے ہندوؤں کی فوجیں، لاہور کی سمت مارچ کرتی دیکھی گئی ہیں، تو لاہور خالی ہو گیا تھا۔ لیکن اب ہندوؤں کی فوجیں (عالم خیال میں نہیں واقعۃً) لاہور کے سر پہ تھیں۔ باٹا نگر پر بم پڑ چکا تھا۔ دشمن کی توپوں کے دھماکے سے ہمارے در و دیوار ہل رہے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ چند ساعتوں میں، دشمن کے ٹینک شہر کے گلی کوچوں میں بھر رہے ہوں گے۔ یہ حالات تھے، لیکن حرام جو کسی سمت سے خوف اور ہراسانی کا شائبہ تک بھی دکھائی دیا ہو۔ تمام اہل شہر، کامل سکون اور سکوت کے ساتھ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ نوجوان ان ایمان افروز ولولوں کو لئے ہوئے کہ خدا کا شکر ہے کہ زندگی میں ایسا موقع آ گیا۔ جب ہم دنیا کو بتا سکیں گے کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بوڑھے اس عزم و ثبات کو لئے ہوئے کہ ہم "بنیان مرصوص" کی طرح ڈٹے رہیں گے اور اس آہنی دیوار کو کوئی توڑ نہیں سکے گا۔ بچے یہ ولولہ انگیز نغمات گاتے ہوئے کہ ـــ بہادرو بڑھے چلو ـــ سپاہیو بڑھے چلو ـــ اور عورتیں، سپاہیوں کے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کرنے میں مصروف ـــ اور یہ سب کچھ نہایت نظم و ضبط کے

---

[1] مومن کے معنی امن کی ضمانت دینے والا بھی ہیں۔

ساتھ۔ ان سطور کی تحریر کے وقت، جنگ شروع ہوئی کو قریب دو ہفتے گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں کوئی رات ایسی نہیں گزری جب توپوں کی آواز نے دیواریں نہ ہلا دی ہوں۔ اور کوئی دن ایسا نہیں آیا جب سائرن کی کپکپا دینے والی آواز کان میں نہ پڑی ہو۔ لیکن اِس وقت تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب قوم کے دل کی دیواریں ذرا بھی ہلی ہوں یا ان کی روح میں شمہ بھر کپکپی پیدا ہوئی ہو۔ حوصلے ہیں کہ دن بدن بلند ہو رہے ہیں اور ہمتیں ہیں کہ ساعت بہ ساعت استوار ہو رہی ہیں۔ عام حالات میں، ہر صبح اخبارات میں، دو چار واردا توں کی خبر سامنے آجاتی تھی۔ لیکن ان دنوں میں کسی ایک واردات کی خبر سننے میں نہیں آئی۔ اشیائے خورد و نوش، بغیر کسی دقت اور مشقت کے مل رہی ہیں، اور اپنی قیمتوں پر مل رہی ہیں۔ (بلکہ بعض چیزیں سستی ہو گئی ہیں) اور یہ حالت ایک لاہور ہی کی نہیں۔ سارے ملک کا یہی عالم ہے۔

عقل حیران ہے کہ یا اللہ! کیا یہ وہی قوم ہے جس کا ہم رونا روتے پانچ ستمبر کی رات کو سوئے تھے؟ کیا یہ وہی ملک ہے جس کے کونے کونے میں، ہر قسم کی خرابیاں دکھائی دیتی تھیں؟ یہ راتوں رات اس میں کیا انقلاب آگیا؟ یہ شبا شب اس کی قلب ماہیت کیسے ہو گئی؟

اور ہمارے سپاہی!

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

انہوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے، اس سے دنیا کی تاریخ میں، ایک سنہرے باب کا اضافہ ہو گا اور آنے والی نسلیں ان کے محیر العقول کارناموں کو مثال کے طور پر بیان کیا کریں گی۔ اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اس کی دعا میں کہ

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

کس طرح بدرگاہِ رب العزت مستجاب ہوئی ہیں اور اس کے ان "شاہین بچوں" کے بال و پر نے، دشمن کے فضائیہ میں کیا قیامتیں برپا کر دی ہیں۔ ان کا ـــ پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا ـــ زمانۂ امن میں بیشک ـــ لہو گرم رکھنے کا تھا اک بہانہ ـــ لیکن میدانِ کارزار میں، ان کی اس پلٹ اور جھپٹ نے جس طرح قوم کی تقدیر کو پلٹ دیا ہے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اقبال نے کہا تھا کہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

اس سے پہلے اسے محض ایک شاعر کا تخیل سمجھا جاتا تھا ــــ حالانکہ وہ بار بار کہتا تھا کہ ــــ حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ برتری ــــ لیکن ہماری فضائی، بری اور بحری فوج کے جوانوں نے اس تخیل کو ایک جیتی جاگتی حقیقت میں تبدیل کر کے دکھا دیا۔

اقبالؒ نے کہا تھا کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

دنیا سمجھتی تھی کہ یہ محض ایک فلسفی کا نظریہ ہے جسے حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا، لیکن ہمارے ان کوہ شکن مجاہدین نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ایک نظریہ نہیں، حقیقت ہے۔

قرآن نے کہا تھا کہ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِينَ ۝ (۲/۲۴۹)۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قلیل سی جماعت، ایک جم غفیر پر غالب آجاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے خدا کے اس قانون کے مطابق جس کی رُو سے اس کی نصرت ان کے ساتھ ہوتی ہے جو ثابت قدم رہیں۔ انہی کے متعلق کہا تھا کہ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ..... ..... (۸/۶۵)۔ اگر تم میں بیس سپاہی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دشمن کے دو سو پر غالب آجائیں گے۔ اس "ایک اور دس" کی نسبت کے لئے ہم اپنے صدر اول کے مجاہدینؓ کی درخشندہ داستانیں اپنے بچوں کو سنایا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ دعوے کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔

ملت پاکستانیہ کی اس قلب ماہیت پر بالعموم، اور اس کی افواج قاہرہ کی محیر العقول سرفروشانہ جوشِ کردار پر بالخصوص، آنے والا مورخ، محوِ حیرت ہوگا اور اس کی بنیادی علت (CAUSE) کے لئے بڑی کرید کرے گا۔ لیکن ہمیں اس کی تلاش میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ قوم جس میں زندگی کی حرارت باقی ہوتی ہے، اس کے تحت الشعور میں، اس کی درخشندہ روایات[1] محوِ خواب ہوتی ہیں، اور تاریخ کے نازک موڑ پر وہ اس طرح بیدار ہو جاتی ہیں جس طرح بربط کے تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، ایک جنبشِ مضراب سے، فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ سطح بین نگاہیں ساکت و صامت تاروں کو دیکھتی ہیں۔ لیکن ان کے اندر مضمر نغموں کو نہیں بھانپ سکتیں۔ جنگ، یا اسی قسم کے اور حوادث، قوموں کے عروقِ حیات کے لئے

---

[1] مسلمانوں کی صورت میں، ان روایات سے مراد ہے قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کا کسی وقت محسوس پیکر میں سامنے آنا۔

مضراب کا کام دیتے ہیں اور ان میں پھر سے خونِ زندگی بڑی تیزی سے گردش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے، جنگ کی طرف دعوت دیتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ..... (۸/۲۴)۔

اے ایمان والو! تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی۔

جنگ کے لئے بلاوے کو، زندگی عطا کرنے والی دعوت، اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ قوم کو اپنی مضمر صلاحیتوں اور غیر محسوس خصوصیتوں کا صحیح اندازہ ہی معرکہ آرائی سے ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام　　میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات　　فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل نہ "جل ترنگ"

اسی لئے قرآن کریم نے درخورِ صلوٰۃ و سلام ان مجاہدین کو قرار دیا ہے جو اس قسم کے زلزلہ انگیز، صبر آزما اور ہمت طلب معرکوں میں ثبات و استقامت کا ثبوت دیں۔ (۵/۳۵)۔ قتال فی سبیل اللہ — جو جہاد کی آخری کڑی ہے — جنت کی کلید اور حیات جاودانی کی ضمانت ہے، اس لئے کہ اسی سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی ذات میں کس قدر پختگی پیدا ہو چکی ہے اور وہ زندگی کے آئندہ بلند مراحل طے کرنے کے قابل کس حد تک ہوئی ہے۔ اگر انسانی ذات کو اس کسوٹی پر نہ کسا جائے تو ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ذات کی نشوونما کے متعلق خود فریبی میں مبتلا ہو جائے۔ یہی وہ خود فریبی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً

غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق ناحنظل تراز وست

در روزِ قیامت ایں باو کے ماند
ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف۔ مگر افسوس

سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دل فریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

(مکاتیب اقبال۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۶)

خدا نے، انبیاؑ اور کتب کے ساتھ الحدید — شمشیر خارہ شگاف — کے نزول کا ذکر کیا ہے (۵۷/۲۵)۔ تو اسی لئے کہ اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہے کہ جس میں

پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

وہ حیاتِ جاوداں کی بشارت، مقتولین فی سبیل اللہ کو دیتا ہے، کسی "کشتۂ دوست" کے لئے یہ بشارت نہیں۔ وہ مجاہدین کے ایک ایک عمل کو سچے ترازو میں تولتا اور اس کا وزن لکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

اس راہ میں بھوک اور پیاس کی جس تکلیف کو وہ جھیلتے ہیں جو تکان اور مشقت وہ اٹھاتے ہیں۔ ان کا ہر وہ قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جہاں اس کا پڑنا دشمن کے لئے موجبِ غیظ و غضب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وہ نقصان جو انہیں دشمن کی طرف سے پہنچتا ہے۔

ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عمل صالح بنتی چلی جاتی ہے، (۹/۱۲۰) اور کیوں نہ بنے؟ خدا نے کہا ہے کہ جو شخص کسی ایک جان کو بھی بچا لے، اس کے متعلق یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسان کو بچا لیا (۵/۳۲)۔ آپ پورے پاکستان کو ایک طرف رہنے دیجئے اور صرف ایک لاہور کو لیجئے۔ گذشتہ دو ہفتہ، اس سولہ لاکھ کی آبادی، اور دشمن کی طرف سے بھیانک موت، کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ اور وہ دیوار تھی ہمارے ان جانباز، خود فراموش سپاہیوں کی۔ انہوں نے جان پر کھیل کر، اس پوری آبادی کو بچا لیا۔ نہیں! جنرل موسیٰ، کے الفاظ میں، پاکستان کی آزادی اور غلامی کے درمیان یہی دیوار کھڑی تھی۔ انہوں نے اپنی جانیں دے کر، اس عظیم ملک کی آزادی کو بچا لیا۔ اور پھر یہ ملک، ہمارا قومی وطن ہی تو نہیں۔ یہ ہمارے دین (قرآنی نظام) کا بننے والا گہوارہ بھی تو ہے۔ اس کی حفاظت، دین کی عظیم ترین خدمت ہے۔

یہ ہے جہاد کا مقام ایک مسلم کی زندگی میں!

لیکن جہاد میدانِ جنگ میں، شمشیر بکف نکل کھڑے ہونے کا نام ہی نہیں تقسیم عمل کے لحاظ سے

اس سلسلہ کا ہر کام، جہاد میں شامل ہے۔ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ (۹/۸۸)، تو قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں آیا ہے۔ جان کے جہاد کے لئے نسبتاً کم لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ باقی آبادی مال کے جہاد میں شریک ہوتی ہے، اور جس کے پاس دینے کے لئے مال نہیں، وہ اس پروگرام کی اور مختلف کڑیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ پھر سب سے اہم کڑی ملک میں امن قائم رکھنے اور عوام کا حوصلہ بڑھانے کی ہے۔ دشمن کا سنگین ترین حربہ، سول آبادی میں بددلی پھیلانا ہوتا ہے۔ اس کا مؤثر ذریعہ افواہیں پھیلانا ہے جس کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ شہری دفاع کے سلسلہ میں تمام قواعد و ضوابط کی شدت سے پابندی بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ علاوہ ازیں، جن لوگوں کا گھر بار اجڑ جائے۔ جن کا کاروبار بند ہو جائے، جو کسی طرح مفلوج و محتاج ہو جائیں۔ انکی پوری پوری مدد کرنا، جہاد بالاموال میں شامل ہے۔ غرضیکہ ہر وہ اقدام جو آپ کی مدافعت و تقویت کا موجب ہو اور جس سے دشمن کے منصوبے کمزور ہوں، جہاد ہے۔

ایسے نازک وقت میں، حکومت کی تائید بڑی ضروری ہوتی ہے۔ صدر مملکت کے اس احسان سے تو ہماری آنے والی نسلیں تک سبکدوش نہیں ہو سکیں گی کہ انہوں نے ملک کی عسکری قوت کو اس قدر مستحکم بنا دیا تھا جس کا کسی کو اندازہ تک نہ تھا۔ اور جنہوں نے ایسے نازک وقت میں اس قدر بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر کسی وقت حکومت کی طرف سے کوئی ایسا فیصلہ ہو جس سے بفرضِ محال آپ متفق نہ ہوں، تو اسے ہدفِ تنقید نہ بنائیے۔ اصولی اتفاق کا تقاضا ہوتا ہے کہ جزئی اختلافات کو اہمیت نہ دی جائے۔ اور پھر ایسے وقت میں جب ایک معمولی سی تنقید نہ معلوم کتنے دور رس نقصان کا موجب بن جائے۔ کبائر سے بچنے والوں کی "لمم" (چھوٹی چھوٹی لغزشوں) کو تو خدا بھی قابلِ گرفت قرار نہیں دیتا۔ (۵۳/۳۲)۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ جو معلومات ارباب حل و عقد کے پاس ہوتی ہیں وہ ہمارے پاس نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہمارے مقابلہ میں وہ بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ حالات کی مناسبت سے فیصلے کریں۔

جس وقت تک یہ سطور قلمبند ہو رہی ہیں، ہمارے فلک پیما طیاروں اور کوہ شکن افواج کو کسی محاذ پر بھی کسی قسم کی پسپائی یا ناکامی نہیں ہوئی۔ اور جس عزم بلند اور خارہ شگاف ہمت کا انہوں نے ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ یہ برق خاطف، یہ شہاب ثاقب، یہ آتشیں پرکالے آخر تک کامیاب و کامران رہیں گے اور میدان کارزار سے فاتح و منصور لوٹیں گے۔ لیکن جنگ بہرحال جنگ ہے۔ اس میں کسی مقام پر پسپائی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو تو ہمیں اس سے افسردہ خاطر اور شکستہ دل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس قسم کے حوادث تو اس زمانے میں بھی رونما ہو جایا کرتے تھے جب صحابہ کبارؓ جیسے سپاہی اور رسولِ اکرمؐ

جیسے کماندار ہوتے تھے۔ انہی نقصانات کے وقت قرآن انہیں یہ کہہ کر اطمینان دلاتا تھا کہ اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ اگر آج تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو یقیناً اسی قسم کا زخم تم دشمن کو بھی لگا چکے ہو۔ یہ میدانِ جنگ ہے۔ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (۳/۱۴۰)۔ اس میں پلڑے جھکتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا، اگر کسی مقام پر تمہیں ہنگامی طور پر کوئی نقصان پہنچ جائے تو تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ سوچنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اس لئے کہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (۴۲/۳۰)۔ جو نقصان بھی تمہیں پہنچتا ہے وہ کسی نہ کسی تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے پہنچتا ہے۔ اس لئے ایسے مقام پر گھبرانے اور بدحواس ہونے کے بجائے سوچنا یہ چاہیئے کہ وہ نقصان ہماری کس غلطی کی وجہ سے ہوا ہے اور ایسا کرتے وقت، ایک دوسرے کو موردِ الزام بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سے باہمی تنازع پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر ایسا کرو گے فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا (۸/۴۶)۔ تو تمہاری ہمت ٹوٹ جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے تم استقامت سے کام لو اور جو غلطی ہو گئی ہے مشترکہ اور متحدہ طور پر اس کی تلافی کی کوشش کرو۔ قوم درحقیقت ایک ٹیم ہوتی ہے ٹیم میں اگر کسی وقت کسی کھلاڑی سے کوئی غلطی ہو جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ ساری ٹیم اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائے یا روٹھ کر بیٹھ جائے۔ وہ اس کا خیال کئے بغیر کہ غلطی کس سے ہوئی ہے، اس غلطی کے ازالہ کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے کہ نہ تو ٹیم کی شکست کسی ایک کھلاڑی کی شکست ہوتی ہے۔ اور نہ ہی اس کی کامیابی کسی ایک کھلاڑی کی کامیابی۔ شکست اور فتح پوری کی پوری ٹیم کی ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے بڑی سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸/۲۵)۔ اس آگ سے بچو جس کی چنگاریاں اڑتی ہیں تو وہ انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جن سے زیادتی ہوئی ہو۔ وہ ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس جہاں تک جنگ میں کامیابی کا تعلق ہے، وہ بیشتر ان جانفروشوں کے خون کے بدلے میں حاصل ہوتی ہے جو یہ بلیٹ کر بھی نہیں دیکھتے کہ ان کا خونِ بہا کس نے وصول کیا ہے۔ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۳/۱۷۰)۔ وہ جب اس کا احساس کرتے ہیں کہ ان کے جان دیدینے سے، وہ لوگ جو ان کے پیچھے زندہ ہیں، کس طرح امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو وہ اسے اپنی قربانیوں کا بیش بہا صلہ سمجھتے ہیں اور اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ یہی ہیں وہ زندہ جاوید، شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں پر فائز مردانِ مومن جن کے خون کی آبیاری سے تاکِ ملت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اُولٰٓئِكَ

صَلٰوتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۲/۱۵۵)۔

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد

جب سے صفحۂ ارض پر طلوع و غروب آفتاب کا سلسلہ شروع ہوا ہے، دن چڑھتا ہے اور رات پڑتی ہے۔ لیکن ان میں بعض دن ایسے بھی ہیں جنہیں خدا نے "ایام اللہ" — خود اپنے دن — کہہ کر پکارا ہے۔ یہ "خدا کے دن" وہی ہیں جن میں حق و باطل کی معرکہ آرائیاں ہوتی ہیں۔ اور یہی ہیں وہ دن جن کی یاد دہانی کی تاکید، نبی اکرمؐ کو یہ کہہ کر کی گئی کہ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ انہیں "خدا کے دنوں" کی یاد دہانی کراتے رہو۔ اس لئے کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴/۵)۔ اس میں ہر اس قوم کے لئے جو استقامت پذیر ہو اور یہ چاہے کہ اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں، زندگی کی عظیم نشانیاں ہیں — دنیا میں ہر روز ہزاروں انسان آتے اور ہزاروں دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ پیدائش اور موت کا یہ سلسلہ لاکھوں برس سے جاری ہے۔ لیکن موت و حیات کے اس بحرِ بیکراں میں، وہ نفوس، روشنی کے مینار کی طرح جگمگاتے ہیں جن کی موت، لاکھوں، کروروں انسانوں کے لئے زندگی کا موجب بنتی ہے۔ کس قدر سعادتمند اور خوش بخت ہیں وہ نفوس جنہیں اس قسم کے مواقع میسر ہوں۔

آج ملتِ پاکستانیہ کے سامنے اسی قسم کا معرکہ ہے۔ ہماری نگہ احترام جھکتی ہے:

اُن اربابِ حل و عقد کے سامنے جنہوں نے ایسے نازک وقت میں، اس قسم کا صحیح فیصلہ کیا جس کے لئے بڑے آہنی عزم اور بلند حوصلگی کی ضرورت تھی۔

اُن جسور و غیور مجاہدین کی بارگاہ میں جو شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آگئے اور جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا کہ — بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں — اور

خود ملتِ پاکستانیہ کے حضور جس نے ایسے ہمت شکن حالات میں، بنیان مرصوص (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح کھڑے ہو کر بتا دیا کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

اور ہمارا سرِ نیاز سجدہ ریز ہے اس خدائے عزیز و رؤف کی بارگاہ میں جس کی عطا کردہ راہ نمائی سے قوم کو ایسی جمعیت خاطر نصیب ہوئی کہ جب لوگوں نے اس سے کہا کہ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ

فَاخْشَوْهُمْ - دشمن نے تمہارے خلاف لشکر جرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لیے تم اس سے ڈرو۔ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا - تو بجائے اس کے کہ اس سے وہ خوفزدہ ہو جاتے، ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (۳/۱۷۳) - اور انہوں نے دل کے پورے اطمینان سے کہہ دیا کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے۔ ہمارے ساتھ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت ہے۔ اور یہ وہ قوت ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم نے خدا کی راہ نمائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تو اس کا یہ وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا کہ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (۳/۱۷۴) انہیں دنیا کی کوئی طاقت زک نہیں دے سکے گی اور وہ شاداں و فرحاں، خدا کی عطا کردہ خوشگواریوں سے جھولیاں بھر بھر کر واپس آئیں گے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (۴/۱۲۲) - خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہے؟

پرچہ پریس میں بھیجنے کا وقت ہو گیا ہے اس لئے سردست ہم اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اس وقت جو قومی جذبہ ہنگامی طور پر ابھرا ہے، اسے کس طرح مستقل قومی شعار بنایا جا سکتا ہے، اس کے متعلق پھر کبھی لکھا جائے گا۔ واللہ خیر حافظاً و ھو ارحم الرّٰحمین۔

کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ یہ خبر ملی کہ مجلس صیانت (سیکیورٹی کونسل) نے، اپنے جنرل سکریٹری کی رپورٹ کے پیش نظر یہ ریزولیشن پاس کر دیا ہے کہ (۱) جنگ فوراً بند کر دی جائے (۲) تمام فوجیں ان مقامات پر واپس چلی جائیں جہاں وہ ۵ اگست کو تھیں۔ (۳) باقی رہا کشمیر کا مسئلہ سو اس کے متعلق بعد میں سوچا جائے گا۔ اس ریزولیشن کے مطابق، متحدہ اقوام (U.N) اور اس کی قائم کردہ سیکیورٹی کونسل بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جن اقوام کے سامنے زندگی کی غیر متبدل، مستقل اقدار نہ ہوں، وہ کس طرح عدل و انصاف کے نام تک سے ناآشنا ہوتی ہیں۔

پاکستان کے لئے یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ نازک تھا۔ محولہ بالا ریزولیشن، مجلس صیانت کے اراکین کا متفقہ فیصلہ تھا (صرف ایک اردن نے اس کی مخالفت کی تھی) اس فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا، ساری دنیا سے جنگ، مول لینے کے مرادف تھا۔ دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ یہ فیصلہ عدل و انصاف کے یکسر خلاف اور حقائق سے کھلے بندوں چشم پوشی کا مظاہرہ تھا۔ اس سے مظلومین کشمیر اسی کس مپرسی کے عالم میں رہتے تھے۔

پاکستان کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ ہندو خوشیوں کے شادیانے بجا رہا تھا۔

ساری دنیا بچھری ہوئی نگاہوں سے پاکستان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کشمیر کا مظلوم مسلمان سہمے ہوئے کھڑا تھا۔ کہ صدر مملکت پاکستان کے عزم بلند نے ایک بار پھر انگڑائی لی، اور اس نے ایک ایسی آواز سے، جس میں اعتماد اور یقین کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی تھی، اقوام متحدہ ـــ اور اس کی وساطت سے تمام اقوام عالم ـــ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجلس صیانت کا یہ فیصلہ دھاندلی کے سوا کچھ نہیں۔ ہم امن عالم کی خاطر جنگ بند کرنے کو تیار ہیں لیکن ہماری فوجیں جن مقامات تک پہنچ چکی ہیں، ان سے پیچھے نہیں ہٹینگی۔ اور اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ مجلس اقوام، کشمیر کے فیصلہ کے متعلق کیا اقدامات کرتی ہے۔ اگر ایک مدتِ معینہ کے اندر یہ اقدامات ہمارے نقطۂ نگاہ سے، اطمینان بخش نہ ہوئے تو (جیسا کہ ہمارے وزیر خارجہ، مسٹر بھٹو نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا) پاکستان ایسے نامعقول ادارے کو سات سلام کر کے، اس سے علیحدہ ہو جائے گا اور اپنی راہ آپ اختیار کرے گا۔

مجلس صیانت کو اس جرأتِ بے باک کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور ان شرائط کے ماتحت جنگ روک دی گئی اور اس طرح۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

جنگ اور صلح کے سلسلہ میں قرآن کریم کی راہ نمائی یہ ہے کہ میدانِ کارزار میں تمہارا پلڑا کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸/۶۱)۔ اگر دشمن صلح کی طرف جھکے تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ۔ پاکستان کا جنگ ملتوی کرنے کا فیصلہ، قرآن کریم کی اس راہ نمائی کے عین مطابق ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندو نے پھر فریب دیا تو اس کا کیا علاج؟ تو اس کے متعلق قرآن کریم نے اگلے ہی الفاظ میں کہہ دیا کہ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ اگر ان کا ارادہ ہو کہ تمہیں دھوکا دیں، تو اس میں گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔ جس قانونِ خداوندی نے تمہیں پہلے کامیابی عطا کی تھی، وہی قانون پھر تمہاری تائید و نصرت کے لیے موجود ہوگا ـــ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ (۸/۶۲) ـــ قانونِ خداوندی سے تمسک اور جماعت کا تعاون، کامیابی کی ضمانت ہے۔ جماعت کے اندر اس قسم کے تعاون کا جذبہ کس طرح بیدار ہوتا اور بروئے کار آتا ہے، اس کے متعلق اس نے بتا دیا کہ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ مقصد کی وحدت اور نصب العین کے اشتراک سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا ہو گئی۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ۔ یہ وہ نعمتِ بے بہا ہے جو بازار سے خریدی نہیں جا سکتی، خواہ اس کے لیے دنیا بھر کی دولت بھی کیوں نہ صرف کر دی جائے۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ (۸/۶۳)۔ یہ پیدا ہوتی ہے قانونِ خداوندی کے اتباع سے۔ اسی میں قوم کی حیات، اور زندگی کے ہر معرکہ میں کامیابی

وکامرانی کا راز پوشیدہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے اس وقت قوم کے دل میں جو جذبہ ہنگامی طور پر بیدار ہوا ہے اُسے قوم کا مستقل شعار کس طرح بنایا جا سکتا ہے، اس کے متعلق ہم پھر گذارش کریں گے۔ اس وقت ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اگر قوم نے قرآن کریم کی تعلیم کو اپنے لئے قندیلِ راہ بنا لیا تو ـــــ سرزمینِ پاکستان تو ایک طرف ـــــ خدا کے اس وعدہ کو پورا ہونے میں بھی دیر نہیں لگ سکتی کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ ہم نے تمہیں نوعِ انسان کی لیڈرشپ کے لئے پیدا کیا ہے ـــــ اس لئے ملّتِ پاکستانیہ کے نام ہمارا پیغام یہ ہے کہ :

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا عدالت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

زندہ باد! شاہینِ بچگانِ پاکستان۔ زندہ باد!

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رَو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اقبالؒ

۱۱ ستمبر کی یادیں

پاکستان کی آزاد مملکت کے قیام سے اب تک ہماری تاریخ ابتلاؤں اور آزمائشوں کی ایک داستانِ مسلسل قرار پائے چلی آرہی ہے۔ اٹھارہ سال کی اس مدت میں ہم بڑے صبر آزما تہلکوں سے گذرتے چلے آئے ہیں۔ ہم نے بڑے کٹھن مراحل طے کئے ہیں۔ بڑے گہرے زخم کھائے ہیں۔ زہرہ گداز صدمے برداشت کئے ہیں۔ اور اس صورت حال کا جس عزم اور جرأت سے سامنے کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک سنہری باب ہے ان صدموں میں سب سے ہوشربا حادثہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کا وہ المیہ تھا جو ہمارے سروں پر ایک سانحۂ قیامت بن کر گذرا۔ یہ المیہ قائداعظمؒ کی رحلت کا دلدوز و جگر سوز سانحہ مغم تھا جس نے ابتلاء و آزمائش کے ایک نازک موڑ پر ہمیں ہمیشہ کے لئے اس قائد جلیل کی عظمت آفریں قیادت اور سرپرستی سے محروم کر دیا جو کاروان ملت کو بے مثال عزم، حسن تدبر، مومنانہ فراست اور بلند نگہی سے عروج و اقبال اور عظمت رفتہ کی گم گشتہ منزلوں کی طرف بصد انداز یکتائی رواں دواں بڑھائے چلا آرہا تھا۔

نگہ بازگشت

قائداعظمؒ کی انقلاب آفریں قیادت سے محروم ہوئے ہمیں سترہ برس ہوئے لیکن آج بھی جب ہماری نگاہیں ماضی کی طرف اٹھتی ہیں اور آزادی و استقلال کی منزلوں کی طرف ہمارے تاریخی سفر کا وہ درخشاں دور نگاہوں کے سامنے آتا ہے جو ان کی عظیم قیادت میں ہم نے مردانہ وار طے کیا تو اس کی بدولت ہمارے سینوں میں نئے عزائم انگڑائیاں لینے لگ جاتے ہیں ہمارے قومی دلوں میں ایک نیا طوفان موجزن ہو جاتا ہے اور وہ شہ نشان ابھر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں جو اس قافلہ سالار کے ہماری قومی جدوجہد کی گذرگاہوں میں قائم کئے اور تاریخ نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لوح زمانہ پر محفوظ کر دیا۔ ان شہ نشانوں کو نگاہوں کے سامنے پاکر ملت پاک کا ہر قلب احساس یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں اگر یہ عظیم قائد اور دور اندیش مدبر

ہماری قیادت کے لئے میدان میں نہ آتا اور اس کے مضبوط ہاتھوں سے سیاسی عیاری اور مکاری کے وہ پردے چاک نہ ہوتے جو اردھا آشرم کے مہاتما اور آنند بھون کے پنڈتوں نے ملّت کے اجتماعی شعور پر مسلط کرنے کی سازش کی تھی تو آج ہمارا حشر کیا ہوتا۔ ہم کس بے بسی اور بیچارگی کے عالم میں اہمسا کے دام فریب کا شکار ہو جاتے اور کس بے دردی سے جمہوریت کے دلفریب نام پر ہمیشہ کی گہری نیند سلا دئے جاتے۔

آج ملّتِ پاک، ہندو سامراج کے ناپاک استعماری عزائم کے مقابل عزم و جرأت سے صبر آزما ہے۔ اور جنگ کے میدانوں میں ان مذموم عزائم کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ ۱۹۳۷ء میں جب یہ ناپاک عزائم اندر ہی اندر اردھا آشرم اور آنند بھون میں پرورش پا رہے تھے اور خود ہمارے امام الہند اور شیخ الہند کی مقدس عبائیں اس کی پردہ داری کا مقدس فریضہ سرانجام دے رہی تھیں۔ تو وہ کون تھا جس نے یہ سارے نقاب الٹ دیئے۔ یہ پرفریب عبائیں تار تار کر دیں اور اس بدترین سازش کو بے نقاب کر کے رکھ دیا جو آزادی اور جمہوریت کے بلند بانگ نعروں میں بتدریج تکمیل پا رہی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر

کانگریس کے عزائم کو بے نقاب کرنے کے سلسلے میں قائداعظمؒ کے عظیم کارناموں کے ساتھ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ایک وقت تھا جب انہیں "ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر" کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ان کی ہندو مسلم اتحاد کی عظیم خدمات کے اعزاز میں بمبئی کے آزادی پسند "جناح میموریل ہال" کی تعمیر عمل میں لا رہے تھے۔ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے قائداعظمؒ کی انہی خدمات خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> ہیں بڑی مدت سے مسٹر جناح کو جانتی ہوں انکے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے، میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کو کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

(MY LEADER — by Z.A. SALEHRI)

خود مہاتما گاندھی نے ان کی زندہ جاوید سیاسی معرکہ آرائی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> مسلم لیگ ایک عظیم القدر آرگنائزیشن ہے۔ اس کا صدر (قائداعظمؒ) ایک وقت میں کانگرس کا پرجوش حامی تھا۔ اور اس سے ہماری بہترین امیدیں وابستہ تھیں۔ لارڈ ولنگڈن سے ان کی معرکہ آرائیاں کبھی

فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

(ہریجن — ۷۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

نیا موڑ

آخر وہ دن آگیا جب کانگریس کی مہا سبھائی ذہنیت اس "پیامبر اتحاد" کی عقابی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو کر آگئی۔ یہ پہلی گول میز کانفرنس کا مرحلہ تھا۔ جہاں جناح نے ہندو نیشنلسٹ لیڈرشپ کو اس کے حقیقی روپ میں بھانپ لیا اور انہیں کہنا پڑا کہ

گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا۔ خطرہ نمودار ہوتے ہی ہندو دل و دماغ، ہندو جذبات اور ہندو روش ایسی صورت اختیار کر گئے کہ بالآخر اتحاد کی توقع ہی اٹھ گئی۔

ہندو مسلم اتحاد کے پلیٹ فارم سے سالہا سال تک حصول آزادی کی جدوجہد کا یہ انجام! قائد اعظمؒ کانگریس اور اس کے لیڈروں کے عزائم کو بخوبی سمجھ گئے اور اس کے بعد انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ پورے ایشیا بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا حرف آغاز بن گیا۔ یہ فیصلہ تھا دس کروڑ ہندی مسلمانوں کی تنظیم اور ہندوؤں سے ایک الگ قوم کی حیثیت سے ان کے لئے جداگانہ مملکت کے حصول و قیام کا فیصلہ۔ چنانچہ وہ ایک بھرپور عزم لے کر اس مقصد کیلئے میدان میں نکل آئے اور پوری ملت کو ایک جھنڈے تلے منظم ہونے کی دعوت دی۔ ۱۹۳۷ء کا آل انڈیا مسلم لیگ کا لکھنؤ کا سالانہ اجلاس سلسلۂ تنظیم کی کڑی تھا۔ یہ ہماری سیاسی تاریخ کا پہلا نمائندہ اجتماع تھا جس میں برصغیر کے گوشے گوشے سے قوم کے نمائندے ایک سچا عزم لیکر شریک ہوئے۔ متحدہ بنگال کے اس وقت کے وزیر اعظم مولوی ابوالقاسم فضل الحق، متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات، آسام کے صوبائی وزیر اعظم خان سعد اللہ خاں پہلی بار اپنے وزراء اور سیکرٹریوں کے لاؤ لشکر سمیت لکھنؤ کے اس تاریخی اجلاس میں شریک تھے۔ چنانچہ اس اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران قائد اعظمؒ نے فرمایا۔

کانگریس نے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ اس نے نام نہاد نیشنلزم کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کانگریس کی موجودہ پالیسی جماعتی عناد اور فرقہ دارانہ منافقت پیدا کر کے ملوکانہ تسلط کے استقرار کا باعث ہوگی۔

(خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس مسلم لیگ۔ لکھنؤ ۱۹۳۷ء)

فریب عظیم کی نقاب کشائی

قومی سفر کے اس نئے مرحلے پر قائداعظمؒ کی نگاہیں نئی نسل کی طرف اُٹھیں۔ یہ شاہیں بچے ان کی امیدوں کا مرکز و محور تھے اور ان کی عقابی نگاہوں نے بہت جلد اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ نئی نسل کے دل و دماغ آزادی اور جمہوریت کے ان پر فریب نعروں سے شدید طور پر متاثر ہوتے جا رہے ہیں جو ہندو کانگرس اپنے ابلہ فریب عزائم کو چھپائے رکھنے کے لئے بلند کر رہی ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۳۸ء میں انہوں نے علی گڈھ یونیورسٹی کے نونہالوں سے خطاب کرتے ہوئے ان پر اس دام فریب کی حقیقت واضح کی اور فرمایا۔

> کانگرس نے ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ کو زہر آلود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور انہیں ایسے سبز باغ دکھائے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ کانگرس واقعی آزادی کامل کی علمبردار ہے۔ لیکن درحقیقت کانگرس کا مقصد کیا ہے؟ وہ حکومت برطانیہ سے بعض عہد و پیمان حاصل کرنا چاہتی تھی اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو اب وہ نہ صرف اسی دستور سے مستفید ہو رہی ہے، بلکہ اس پر پوری طرح عمل پیرا ہے جسے تباہ کرنے کا دعویٰ بڑے شد و مد سے کیا جاتا تھا۔

انہوں نے اس خطاب میں مزید فرمایا ——

> مسلم لیگ نے بڑی حد تک مسلمانوں کو برطانوی سامراج کے پنجہ سے نجات دلا دی ہے۔ لیکن اب ایک نئی طاقت سامنے آئی ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ وہ برطانیہ کی جانشین ہے۔ آپ اسے جس نام سے چاہیں پکاریں لیکن اصل میں وہ ہندو اور صرف ہندو راج ہے۔

منزل کی نشاندہی

آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں انہوں نے کانگرس کی خالص مہاسبھائی ذہنیت سے پوری طرح نقاب اٹھاتے ہوئے اس کا ایک پہلو نمایاں طور پر اپنی ملت کے سامنے پیش کیا اور واضح کیا کہ

> مسلمان اگر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو از سر نو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں صرف ایک ہی چیز یہ سہارا مہیا کر سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے یقین کو دوبارہ حاصل کریں اور اسی محکم اور بلند تصور کا سہارا لے کر اٹھیں جو انکی عالمگیر قومی وحدت کا جزو لاینفک ہے اور جو انہیں ایک سیاسی وحدت میں منسلک

کرنے کا باعث ہوگا۔

مسلمانوں کے خلاف اغیار کے فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے طنزیہ نعرے سُنکر آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ دنیا کا بدترین، رجعت پسند اور شدید ترین فرقہ پرست جب غیر مشروط طور پر کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی قوم کو گالیاں دیتا ہے تو اگلے ہی روز وہی سب سے بڑا نیشنلسٹ قرار پا جاتا ہے۔

(خطبہ صدارت۔ اجلاس لکھنؤ ۱۹۳۷ء ۔ از "قائداعظم")

قائداعظمؒ کی یہ آواز برصغیر کی فضا میں صورِ اسرافیل بنکر گونج اٹھی۔ اور ملت اسلامیہ کے جمود اور بے حسی کے قبرستانوں میں زندگی انگڑائیاں لینے لگی۔ برصغیر کے گوشے گوشے سے "لبیک لبیک" کے نعرے گونج اٹھے اور کانگرس کا سہانا خواب، پریشاں ہونے لگا۔ اس صورت حال پر گاندھی جی جیسا شاطر اور متحمل مزاج سیاسی مہاتما بھی تلملا اٹھا اور افترا پردازی کا سہارا لیتے ہوئے وہ قائداعظمؒ کے حسن نیت پر حملہ آور ہوا، اپنے اخبار "ہریجن" میں ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے اس نے لکھا

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولت برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگرس کرے اور دے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

(ہریجن۔ بحوالہ مسئلہ دستور ہند از خان لیاقت علی خاں)

چومکھی جنگ کا اعلان

لیکن گاندھی جی کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اس شرمناک حملہ کے بعد اپنے آپ کو قائداعظمؒ کے جوابی حملہ سے بچا سکیں۔ قائداعظمؒ نے گرجتے ہوئے کہا۔

میں مسٹر گاندھی کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانان ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق و مفادات کیلئے کانگرس اور برطانیہ دونوں کے علی الرغم آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر لیا ہے۔ اور کسی دوسرے پر تکیہ کرنا نہیں چاہتے۔ (ایضاً)

قائداعظمؒ ایک قدم آگے بڑھے اور سیاست ہند میں ملت اسلامیہ کی امنگوں اور کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ۱۹۔ جنوری ۱۹۴۰ء کے روزنامہ (TIME & TIDE) میں "ہندوستان کے سیاسی امراض اور انکا علاج" کے عنوان سے ایک حقیقت کشا مقالہ حوالۂ اشاعت کیا اور اس مقالہ میں گاندھی جی کی سیاسی عیاریوں کا پول کھولتے ہوئے لکھا۔

مسٹر گاندھی جو صف اول کے ایک ہوشیار سیاست دان ہیں، کی قیادت میں کانگرس نے (جو بالخصوص ایک ہندو جماعت ہے) بہت دنوں پہلے یہ پیش بینی کر لی تھی کہ مغربی جمہوریت کے اندر ہندوؤں کے لئے تمام ہندوستان پر مستقل غلبہ حاصل کرنے کی امیدوں کی تکمیل کا سامان پوشیدہ ہے چنانچہ ان کی تمام کوششیں اور قوتیں اس پر مرکوز ہوگئیں کہ ہندوستان کے لئے ایک جمہوری طرز کی حکومت حاصل کی جائے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر نئے دستور کو ان اصولوں پر چلایا جا سکے جو ان کے لیڈروں اور ورکنگ کمیٹی نے ترتیب دیئے تھے تو نیا دستور انہیں منزل مقصود کے انتہائی قریب پہنچا دے گا

(ٹائم اینڈ ٹائڈ ـــــ بحوالہ مسئلہ دستور ہند)

قائداعظمؒ حکومت برطانیہ پر یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اگر وہ کانگرس کے سامنے جھک گئی اور برصغیر کی قسمت کا فیصلہ مسلمانوں کی منشاء کے بغیر طے کیا گیا تو مسلمان اسے خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ اسی مقالہ میں انہوں نے برطانوی حکمرانوں کو انتباہ کرتے ہوئے لکھا۔

اگر برطانوی حکومت (کانگرس کے اس مطالبے سے) ہراساں ہوگئی اور جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حال کے تنکوں میں ڈھکے ہوئے گڑھے میں گر گئی تو ہندوستان انتہائی نازک صورت حال سے دوچار ہو جائے گا اس کے نتائج کے بارے میں آج کوئی شخص پیشگوئی نہیں کر سکتا لیکن میں یقیناً یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسلامی ہند کسی قیمت پر ایسی پوزیشن پیدا نہیں ہونے دیگا اور وہ اپنی تمام قوت اور ذرائع جو اسے حاصل ہیں اس کے مقابلے میں بروئے کار لے آئیگا (ایضاً)

انتباہ انہوں نے لنڈن کے مشہور اخبار ڈیلی میل (DAILY MAIL) میں اسلامی ہند کے اس عزم کی مزید وضاحت فرمائی اور اعلان کیا ـــ

مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہند اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیان ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومت برطانیہ کے آخری فیصلے کو قبول کریں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہترین ثابت ہو سکے گا اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود

اسلامیانِ ہند کی منشاء پر موقوف ہے اور وہی اس کا آخری فیصلہ کریں گے۔
(ڈیلی میل - بحوالہ مسئلہ دستور ہند از لیاقت علی خان)

اس بیان کے جلد ہی بعد انہیں دلّی میں مولانا شوکت علی مرحوم کی ایک یادگار کی نقاب کشائی کی تقریب میں شرکت فرمانے کا موقع ملا۔ اور اس موقع پر اپنے خطاب میں قومی مشکلات اور کمزوریوں کے مختلف گوشوں کی نشان دہی کے بعد انہوں نے اعلان کیا۔

ان تمام مشکلات کے باوجود جو ہماری راہ میں حائل ہیں، میرا اب بھی یقین ہے کہ مسلمان ہر دوسری قوم سے بہتر سیاسی دماغ رکھتے ہیں۔ سیاسی ذکاوت ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ اسلام کی حرارت ان کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے فیصلے چند آدمیوں کے فیصلے نہیں بلکہ پوری قوم کی آواز ہیں تو میں خوشی خوشی پیش قدمی کا حکم دونگا۔ اور سب سے پہلے سینے پر گولی کھانے کے لئے آگے بڑھوں گا۔ اس سے قبل کہ میں آگے بڑھنے کا حکم دوں میں یہ یقین حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ دشمنوں پر فتح پانے کے معقول امکانات موجود ہیں۔ (ایضاً)

قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس منعقدہ ۱۹۴۱ء کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس عزم کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

زندگی اور موت کا سوال

یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس پاکستان کانفرنس منعقدہ لاہور میں جداگانہ مملکت کے قیام کو زندگی اور موت کا سوال قرار دیا اور نونہالان ملت کو مخاطب کرتے ہوئے منزل کی اہمیت ان الفاظ واضح کی کہ

یاد رکھئے کہ جس مقصد عظیم کے لئے ہم برسرپیکار ہیں وہ محض مادی مفاد پر مبنی نہیں۔ بلکہ یہ ملت اسلامیہ کی روح کی پکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ آپ سے مسلمانوں

کی زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دیتا ہوں۔ اسے سودے بازی کہنا سراسر غلط ہے۔ مسلمان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر ہم نے یہ بازی ہار دی تو ہم سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔

تحریک پاکستان کی ناکامی سے ملت کا انجام کیا ہوگا اس کے بارے میں انہوں نے قوم کو ایک بار پھر خبردار کیا۔ یہ ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۵ء کو یوم پاکستان کی تقریب پر قوم کے نام ان کے پیغام کا نقطۂ ماسکہ تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ

ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو کے تمام تقاضے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ختم ہو کر رہ جائیں گے اور اس برصغیر سے مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

(SPEECHES & WRITINGS OF MR. JINNAH. VOL II. P. 359)

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ اس مملکت کا حصول و قیام قائداعظمؒ کے عزم و فراست کا ایک جیتا جاگتا شاہکار تھا۔ اور اس کی بدولت ملت نے اپنی منزل مراد کو پالیا۔ لیکن تاریخ کے اس اہم فیصلے کے باوجود یہ جنگ ختم نہ ہوئی اور برابر جاری رہی۔ قائداعظمؒ کی یہ فتح عظیم اور مملکت پاکستان کا قیام ہندو لیڈرشپ کی مہاسبھائی ذہنیت کے لیے رستا ہوا ناسور بن گیا۔ اس زخم سے برابر خون رستا رہا۔ اس کے وحشیانہ تعصب اور انتقام کی آگ اٹھارہ سال تک برابر سلگتی اور شعلے بکھیرتی رہی آخرکار یہ شعلے پوری تندی سے بھڑک اٹھے اور پاکستان اور بھارت کے مابین زندگی اور موت کی ایک تاریخی جنگ کا آغاز ہوگیا۔

آج جبکہ ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان حق و باطل کی کشمکش ایک تہلکہ انگیز ٹکراؤ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ سمندروں، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں حق و باطل کے علمبردار ایک دوسرے کے مقابل سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ چاروں طرف توپوں کی گھن گرج سے تہلکے برپا ہیں۔ بموں کے دھماکوں سے ہر سمت قیامت کے زلزلے متحرک ہیں نشۂ قوت کی بدمستی میں بھارتی حکمرانوں نے پاکستان کے مقابل اپنی کئی گنا مسلح قوت جنگ کی آگ میں جھونک دی ہے۔ دو ملکوں اور دو قوموں کے درمیان یہ خونین معرکہ جاری ہے اور اس ہنگامۂ قیامت میں قائداعظمؒ کی روح کی یہ پکار پھر فضاؤں میں گونج رہی ہے کہ

اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ختم ہو کر رہ جائیں گے اور اس برصغیر سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ کر رہ جائے گا۔

یہ الفاظ فضا میں گونج رہے ہیں اور ملت پاکستان کے لاکھوں سرفروش سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے اسکا جواب دے رہے ہیں کہ جبتک ایک ایک پاکستانی زندہ ہے وہ آگ اور خون کے طوفانوں سے گذر کر بانیٔ پاکستان کی امیدوں کی لاج رکھیگا۔ حکومت پاکستان نے بے مثال عزم کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارتی سامراج کا چیلنج قبول کیا ہے اور خود پاکستان نے جس غائخانہ جرأت و شجاعت سے اس چیلنج کو قبول کیا ہے دس کروڑ پاکستانی ایک بنیان مرصوص کی صورت میں جس جہاد آفریں ولولے سے اس سالار انقلاب کی پشت پر سر بکف کھڑے ہیں اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ پاکستان کی حکومت اور عوام قائداعظمؒ کی اس مقدس امانت کی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ ہیں اور اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے کفن بردوش دشمن کے مورچوں کی طرف قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔ وہ شاہبازوں کی طرح ان کرگسوں پر جھپٹے ہیں جو کل تک چھوٹی چھوٹی بے بس ریاستوں پر کام و دہن کی آزمائش میں دنیا بھر کی ذلت و رسوائی خرید چکے تھے۔

اے کاش! قائداعظمؒ آج خود زندہ ہوتے اور جیتے جاگتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ انہوں نے پاکستان کی امانت کو جس قوم کے سپرد کیا تھا اس کے جیالے مجاہد اس امانت کے تحفظ کیلئے کس سرفروشی اور جانبازی سے آخری خندقوں تک بڑھ سکتے ہیں۔ دس کروڑ سرفروشانِ اسلام کی یہ قوم آج اپنے صدیوں کے ذلیل دشمن کے مقابل سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہے اور قائداعظمؒ کی روح کو یہ یقین دلا رہی ہے کہ وہ یہ بازی جیت کر دم لے گی۔ اور اپنے جنگی کارناموں سے ان سیاسی فتوحات کو چار چاند لگا دے گی جو قائداعظمؒ نے وار دھا آشرم اور آنند بھون کے مہرہ بازوں کو شکست فاش دے کر حاصل کی تھیں۔ پاکستان انہی فتح مندیوں کا تاریخی شاہکار تھا اور اس کی حفاظت زندگی کا وہ مقدس فریضہ ہے جسے ملت پاکستان سر دھڑ کی بازی لگا کر ادا کر رہی ہے اس جنگ میں کامیابی قائداعظمؒ کی خدمت میں بہترین خراج تحسین اور ان کی زندہ جاوید یادگار ہو گی۔

(واللہ المستعان)

کشمیر
اقبالؒ کی نظر میں

علامہ اقبالؒ کو کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ خود کشمیری الاصل تھے — وہ تو، وہ درویش خدامست تھے جس کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ — گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند — اصل یہ ہے کہ اہل کشمیر کی جگر سوز مظلومیت نے اقبالؒ کے قلب حساس سے کشمیر کی یاد کبھی محو نہیں ہونے دی۔ اس نے اپنے کلام اور مکتوبات میں جا بجا کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس تذکرہ کے ساتھ ہی اس کی نگہ دور رس نے اس حقیقت کا بھی مشاہدہ کر لیا تھا کہ اہل کشمیر کی محکومیت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کی یخ بستہ وادیوں سے روح انقلاب ابھر یگی اور اپنی غلامی کے اطواق و سلاسل کو توڑ کر رکھ دے گی۔ یہ کچھ اقبالؒ نے ۱۹۳۸ء سے پہلے کہا تھا۔ دیکھئے کہ حالات اس کی دیدہ وری کی کس طرح تصدیق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانیوالی ہے۔

پھر انہوں نے مسلم کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۲ء کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا

کشمیر کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہیں کہ میں واقعات کے اس پس منظر کو بھی بیان کروں جو اس ملک میں حال ہی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا بظاہر اچانک قیام جس کا شعار خودی قریباً مردہ ہو چکا تھا۔ باوجود ان مصائب کے جو اس قیام کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ہر اس شخص کے لئے مسرت کا باعث ہے جس کی نگاہ عصر حاضر کی ایشیائی تحریکات آزادی کے محرکات پر ہے۔ اہالیان کشمیر کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی ہونہار اور ہنرمند قوم کا اپنے تشخص میں اعتماد کا از سر نو احیا آخر کار نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ ہندوستان بھر کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ سب سے

زیادہ قابلِ مذمت فرقہ وارانہ منافرت ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اہلِ کشمیر سے قدرتی دلچسپی سے ہندوؤں نے جوابی تحریک شروع کردی ہے جس کا مقصداز رہِ یاس یہ ہے کہ پان اسلام ازم اور برطانوی تسلط کے ہوّے کھڑے کرکے کشمیر کی ہیربری حکومت کو بچایا جائے۔

مظلومیت کی داستان

وہ جاوید نامہ میں، شاہ ہمدان سے اپنی ملاقات کے وقت کہتے ہیں:

زیرِ گردوں آدم آدم را خورد ۔۔۔ ملتے بر ملتے دیگر چرد
جاں زاہلِ خطہ سوزد چوں سپند ۔۔۔ خیزد از دل نالہ ہائے دردمند
زیرک و دراک و خوش گل ملتے است ۔۔۔ در جہاں تردستی او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ او ۔۔۔ در نےِ من نالہ از مضمونِ اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است ۔۔۔ در دیارِ خود غریب افتادہ است
دست مزد او بدستِ دیگراں ۔۔۔ ماہیِ رودش بہ شستِ دیگراں
کارواں ہا سوئے منزل گام گام ۔۔۔ کارِ او ناخوب و بے اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد ۔۔۔ آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
تا نہ پنداری کہ بود است ایں چنیں ۔۔۔ جبہہ را ہموارہ سود است ایں چنیں
در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بودہ است
کوہ ہائے خنگ سارِ او نگر ۔۔۔ آتشیں دستِ چنارِ او نگر
در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ ۔۔۔ خیزد از خاکش یکے طوفانِ رنگ
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن ۔۔۔ پنبہ پراں از کمانِ پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب ۔۔۔ من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

اس مقام پر غنی کاشمیری کی روح اقبالؒ سے کہتی ہے:

مرغکے می گفت اندر شاخسار ۔۔۔ با پشیزے می نیرزد ایں بہار
لالہ رست و نرگسِ شہلا دمید ۔۔۔ بادِ نوروزی گریبانش درید

عمرہا بالید ازیں کوہ و کمر — نستر از نورِ قمر پاکیزہ تر
عمرہا گل رخت بربست و کشاد — خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک — مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیِ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر

اس قوم کے ساتھ کیا ہوا؟

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی — حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند — قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

آثارِ حیات

لیکن اقبالؒ کو اس بظاہر مردہ قوم میں زندگی کے آثار نمایاں طور پر دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو — تھرتھراتا ہے جہانِ چار سوے و رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر — کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں — عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش — حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

دراج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں — حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم — مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور — وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار — ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

نصیب خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش — کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک — گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یک دانہ

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے | بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویم فردا ہے باطل | گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیر جہاں اس قدر آتشیں ہے | کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے | نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک | خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

غنی کاشمیری کے الفاظ میں

وہ جاوید نامہ میں، غنی کاشمیری کی زبان سے، اس انقلاب کے امکان کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ہیچ می دانی کہ روزے در وُلر | موجہ می گفت با موجِ دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم | خیز تا یک دم بساحل سر زنیم
زادۂ ما یعنی آں جوئے کہن | شور او در وادی و کوہ و دمن!
ہر زماں بر سنگِ رہ خود را زند | تا بنائے کوہ را بر می کند
آں جواں کو شہر و دشت و در گرفت | پرورش از شیرِ صد مادر گرفت
سطوتِ او خاکیاں را محشرے است | ایں ہمہ از ماست نے از دیگرے است
زیستن اندر حدِ ساحل خطا است | ساحلِ ما سنگے اندر راہِ ماست
با کراں در ساختن مرگِ دوام | گرچہ اندر بحر غلطی صبح و شام

زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت
اے خنک موجے کہ از ساحل گذشت!

اس کے بعد غنی واضح تر الفاظ میں کہتا ہے:

دل میانِ سینۂ شاں مردہ نیست | اخگرِ شاں زیرِ یخ افسردہ نیست!
باش تا بینی کہ بے آوازِ صور | ملتے خیزد از خاکِ قبور!

بالآخر اس "خاکِ قبور" سے ایک زندہ و تابندہ ملت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا اس کا حافظ و ناصر ہو، اور اسے اس کے ہر بلند مقصد میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے تاکہ "منتظرِ یومِ مکافات" دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ

ظالم پنپ نہیں سکتا۔

بچوں کا صفحہ

جنگ کیوں ہوتی ہے

ایک دن ایک بچہ اپنے گھر کے باہر گلی میں کھیل رہا تھا کہ اچانک ایک شخص آیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اتفاق سے اسوقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بچے کو اٹھایا اور اپنے جھولے میں ڈال کر بھاگ گیا۔ جب بچہ گھر واپس نہ آیا تو اسکے ماں باپ کو تشویش ہوئی۔ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کی۔ بچہ کہیں نہ ملا۔

آپکو معلوم ہے کہ بچوں کو چرا کر لے جانے ان بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں، وہ انہیں دور لے جاکر بیچ دیتے ہیں۔ جو ظالم کسی بچے کو خریدتا ہے وہ اس کا ہاتھ پاؤں توڑ دیتا ہے۔ یا اُسے اندھا بنا دیتا ہے۔ دن رات اس پر ظلم کرتا ہے۔ اور پھر اسے بھکاری بنا کر اس سے بھیک منگواتا ہے۔ اسے روکھی سوکھی روٹی کھانے کو دیتا ہے۔ اور جو کچھ وہ مانگ کر لاتا ہے، اُسے خود لے لیتا ہے۔ اس بچے کی ساری عمر اسی طرح غلامی میں گذر جاتی ہے۔ سوچو بچو! کہ یہ کتنا بڑا ظلم ہے؟

اب یہ بتاؤ اگر کسی جگہ اسی قسم کے کسی بچے پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ چیخے چلائے کہ خدا کیلئے مجھے بچاؤ۔ تو جس شخص کے کان تک اسکی فریاد پہنچے، کیا اس پر لازم نہیں آئیگا کہ وہ اسکی مدد کو پہنچے؟ اگر یہ شخص اس کی مدد کو پہنچے لیکن وہ ظالم سامنے سے چاقو دکھائے، تو کیا اس کے لئے ضروری نہیں ہوگا کہ یہ اُس کے ہاتھ سے چاقو چھیننے کی کوشش کرے اور کسی نہ کسی طرح اس بچے کی جان بچائے؟ تم یقیناً کہوگے کہ اُسے ایسا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس بچے کی فریاد نہیں پہنچتا اور اُس ظالم کے ہاتھ سے چاقو نہیں چھینتا تو اپنا انسانیت کا فرض ادا نہیں کرتا،

یہ ہے کہانی۔ عزیز بچو! اس جنگ کی۔

کشمیر کا ملک بڑا خوبصورت اور زرخیز علاقہ ہے۔ وہاں کے رہنے والے خوش و خرم زندگی

بسر کرتے تھے کہ انگریزوں نے اس پر زبردستی قبضہ کرکے اسے ایک شخص۔ گلاب سنگھ، کے ہاتھوں بیچ دیا۔ گلاب سنگھ نے فوجی طاقت کے ذریعے اس ملک کے باشندوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ وہ اس ملک کی ساری دولت لوٹ لیتا تھا اور وہاں کے رہنے والوں کو نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ پہننے کو کپڑا۔ وہ بڑے عذاب میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جب انگریز ہندوستان سے چلا گیا اور اس طرح سارے ہندوستان کو آزادی مل گئی تو کشمیر والے بھی خوش ہوئے کہ وہ بھی آزاد ہو جائیں گے۔ لیکن اس پر ہندوستان نے قبضہ کرلیا اور ان بچاروں پر پہلے سے بھی زیادہ ظلم ہونے لگا جب انہوں نے اس غلامی کے خلاف چیخنا شروع کیا تو، جیسا کہ ایک ہمدرد قوم کا فریضہ ہوتا ہے، پاکستان ان کی مدد کے لیے پہنچا اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں ہندوؤں کی غلامی سے نجات دلا دے گا۔ ہندوؤں نے اوپر اوپر سے یہ وعدے کرنے شروع کر دیئے کہ ہم کشمیر والوں کو آزاد کر دینگے لیکن اندر اندر بہت سے ہتھیار جمع کرنے شروع کر دیئے۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ ان کے پاس کافی ہتھیار جمع ہو گئے ہیں تو انہوں نے پاکستان سے کہہ دیا کہ خبردار! اگر تم نے کشمیر والوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو ہم تم پر ہلہ بول دیں گے۔ کشمیری بچارے، اپنی مظلوم آنکھوں سے پاکستان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ انہیں ظالم ہندوؤں کے ہاتھ میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے یا ان کی حفاظت کرتا ہے۔

بتاؤ بچو! ان حالات میں پاکستان کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟ تم یہی کہوگے کہ پاکستان کو ان بچارے مظلوموں کی مدد کرنی چاہیئے تھی خواہ اس میں اپنا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ پاکستان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ہندوؤں سے کہہ دیا کہ ہم اپنی جانیں دیدیں گے لیکن تمہیں کشمیریوں پر ظلم نہیں کرنے دیں گے۔ ہندوؤں نے اپنی طاقت کے نشہ میں بدمست ہوکر پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستان کے لئے اس کا جواب دینا ضروری تھا۔

پاکستان نہ کسی پر ظلم کرنا چاہتا ہے۔ نہ کسی کا ملک لینا چاہتا ہے۔ وہ صرف مظلوم کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ جب ظالم کے ظلم کی روک تھام کے لئے جنگ کرنا پڑے تو اسے جہاد کہتے ہیں۔ اس جہاد میں ہر ممکن طریق سے مدد کرنا بڑا نیک کام ہوتا ہے۔ اسی سے قوم باعزت زندگی جی سکتی ہے۔

جوشِ کردار

رازِ ہے، رازِ ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!

اقبالؒ

ہماری تاریخ

(مودودی صاحب سے چند سوال)

گذشتہ چند ماہ سے، ماہنامہ ترجمان القرآن میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے قلم سے ایک سلسلۂ مضامین بالاقساط شائع ہو رہا ہے جس کا موضوع (بقول اُن کے) یہ ہے کہ خلافت راشدہ، ملوکیت کی طرف کس طرح منتقل ہوئی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس رجحان کا آغاز حضرت عثمانؓ کے زمانے سے ہوا اور تکمیل حضرت معاویہؓ کے عہد میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ انتقال ان حضرات کے ہاتھوں سے ہوا جو صحابہؓ کے زمرے میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں، اُس دور میں ایک کثیر جماعت صحابہؓ کی موجود تھی۔ ان میں سے بھی اکثر اس کام میں اُن حضرات کے ساتھ شریک تھے۔ مودودی صاحب نے ان سب کو اپنی تنقید کی لپیٹ میں لے لیا۔ اس پر بعض حلقوں کی طرف سے ان پر کچھ اعتراضات ہوئے۔ ان اعتراضات کے جواب انہوں نے ترجمان القرآن کی ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں دیئے ہیں۔ ان کا ملخص حسب ذیل ہے۔

(۱) اس اعتراض کے جواب میں کہ بالآخر آپ کو اس بحث میں الجھنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہماری (صدر اول کی) تاریخ کی عام اشاعت ہو چکی ہے۔

> اگر ہم صحتِ نقل اور معقول مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہ کریں گے اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتب طریقے سے دنیا کے سامنے پیش نہ کریں گے تو وہ مغربی مستشرقین، اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل

کے دماغ میں اسلامی تاریخ کا بالکل غلط تصور بٹھا دیں گے (ص ۵۵)

چنانچہ اس کی اہمیت ان کے نزدیک اس قدر تھی کہ وہ برسوں سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کوئی صاحب اس خدمت کو سرانجام دیں۔ لیکن جب کوئی بھی آگے نہ بڑھا تو

مجبوراً میں نے یہ محسوس کیا کہ اس خدمت کو انجام دینا میرے ذمے مسلمانوں کا ایک قرض ہے جسے مجھی کو ادا کرنا ہے۔ (ص ۵۶)

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے صدر اول کی "تاریخ کو اس کے صحیح رنگ میں پیش کرنا (بلکہ اسے نئے سرے سے مرتب کرنا) ہماری اشد ضرورتوں میں سے ہے اور جو شخص بھی اس خدمت کو سرانجام دیگا، ہمارے نزدیک وہ امت کا بہت بڑا محسن اور اسلام کا جلیل القدر خدمت گذار ہوگا۔ (قارئین کو اچھی طرح یاد ہے کہ ہم اس کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق کتنے عرصہ سے لکھتے چلے آرہے ہیں)۔ لیکن آپ ذرا آگے چل کر دیکھیں گے کہ مودودی صاحب نے اس قرضے کو کس طرح چکایا ہے۔

(۲) اپنے ماخذ کے متعلق مودودی صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ بڑی قابلِ اعتماد کتابیں ہیں اس لئے ان میں بیان کردہ "تاریخ کے سچے ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے وہ بالکل سچا تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

اب غور فرمایئے۔ یہ ہیں وہ ماخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔ اگر یہ اس دور کی تاریخ کے معاملہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالت سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے، کیونکہ عہدِ رسالت کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ، شیخین کی تاریخ سمیت، انہی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنہیں ہم کسی کے سامنے بھی وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے"۔ دنیا کبھی اس اصول کو نہیں مان سکتی، اور دنیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول

نہ کریں گی ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں وہ سب صحیح ہیں، مگر جو کمزوریاں یہی کتابیں پیش کرتی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ اور اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ شیعوں کی سازش ایسی طاقت ور تھی کہ ان کے وسائل سے اہلِ سنّت کے یہ لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور ان کی کتابوں میں بھی شیعی روایات نے داخل ہو کر اُس دور کی ساری تصویر بگاڑ کر رکھ دی ہے، تو میں حیران ہوں کہ ان کی اس خلل اندازی سے آخر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت اور ان کے عہد کی تاریخ کیسے محفوظ رہ گئی؟

(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۶۵ء۔ صـ ۶۶)

دیکھا آپ نے کہ یہ دلیل (بظاہر) کس قدر وزنی نظر آتی ہے؟ (اس کی حقیقت کیا ہے، یہ ذرا آگے چل کر سامنے آئیگا)۔

(۳) اب رہا یہ سوال کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا ہے اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس قدر جلیل القدر صحابہؓ کبارؓ کی سیرت (معاذ اللہ) بڑی داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ تو اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ جہاں تک صحابہؓ کے عدول ہونے کا تعلق ہے، ان سب کو بلا استثناء ہم قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور ان کی روایات کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں"۔ لیکن جہاں تک ان کی غلطیوں کا تعلق ہے۔

میرے نزدیک ایک غیر نبی بزرگ کا کوئی کام غلط بھی ہو سکتا ہے اور اس کے باوجود وہ بزرگ بھی رہ سکتا ہے۔ میں کسی بزرگ کے کسی کام کو غلط صرف اُسی وقت کہتا ہوں جب وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے ثابت ہو اور کسی معقول دلیل سے اس کی تاویل نہ کی جا سکتی ہو۔ مگر جب اس شرط کے ساتھ میں جان لیتا ہوں کہ ایک کام غلط ہوا ہے تو میں اُسے غلط مان لیتا ہوں پھر اُس کام کی حد تک ہی اپنی تنقید کو محدود رکھتا ہوں، اور اُس غلطی کی وجہ سے میری نگاہ میں نہ اُن بزرگ کی بزرگی میں کوئی فرق آتا ہے، نہ اُن کے احترام میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔ (ایضاً صـ ۵۸)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

غلطیاں بڑے سے بڑے انسانوں سے بھی ہو جاتی ہیں۔ ان سے ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ ان کا مرتبہ ان کے عظیم کارناموں کی

بنا پر متعین ہوتا ہے نہ کہ ان کی کسی ایک یا دو چار غلطیوں کی بنا پر۔
(ایضاً ص ۶۰)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انکے نزدیک صحابہؓ کی یہ غلطیاں معمولی سہو و خطا ہیں جن سے نہ ان کی سیرت پر کوئی حرف آتا ہے۔ نہ ان کی عظمت اور بزرگی میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ لیکن ذرا آگے چل کر آپ دیکھئے گا کہ یہ غلطیاں کس قسم کی ہیں اور ان سے ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کی کس قسم کی سیرت سامنے آتی ہے۔

اس پس منظر کے بعد ہم مودودی صاحب سے چند ایک سوالات پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں چونکہ ان سوالات کا متعلق ان کی ذات سے نہیں، دین سے ہے، اس لئے امید ہے کہ وہ انکے جوابات دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

پہلا سوال

قرآن کریم میں مہاجرین و انصار کے متعلق لکھا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے۔ اور انہوں نے ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے انہیں پناہ دی۔ اور ان کی مدد کی۔ یہ سب مومن حقا (پکے اور سچے) مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کے مطابق مہاجرین اور انصار سب پکے اور سچے مومن تھے۔ اور خدا نے ان کی مغفرت کی سند عطا کر دی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۹/۱۰۰)

اور مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے سبقت کی۔ اور جنہوں نے حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا۔ ان سب سے خدا راضی ہو گیا۔ اور وہ خدا سے راضی ہو گئے۔

ان کے لئے خدا نے (جنت کے) باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ صحابہ کبارؓ میں سے جنہوں نے ہجرت میں سبقت کی یا انصار کے زمرے میں شامل ہوئے۔ یا جو اسی انداز سے ان کے بعد ان میں شامل ہوئے۔ ان سب سے خدا راضی ہوگیا۔ اور ان کے جنتی ہونے کی اس نے شہادت دیدی۔ سورۂ انفال کی آیت ۸/۷۵ میں بھی ان کے بعد میں آنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ فَاُولٰٓئِكَ مِنكُمْ۔ وہ بھی تمہیں میں سے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے وقت جو صحابہؓ حضورؐ کی معیت میں تھے، ان کی توصیف و تعریف جس والہانہ انداز سے قرآن میں آئی ہے اس پر سورۂ فتح کی آخری آیات شاہد ہیں۔ جو حضرات فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے، اور ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کے مدارج اسابقون الاولون کے برابر تو نہیں ہوسکتے۔ لیکن ان کے متعلق بھی اس امر کی وضاحت کردی کہ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۔ (۵۷/۱۰)۔ ان سب کے ساتھ اللہ نے نہایت اچھا وعدہ کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ صحابہ کبارؓ سب مومن تھے۔ جنت کے مستحق تھے۔ لہٰذا ان سے کوئی اس قسم کا کام سرزد نہیں ہوسکتا تھا جو ایمان کے منافی ہو یا اہل جنت کے شایانِ شان نہ ہو۔ یہ خدا کی شہادت ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی شہادت (ہمارے ایمان کے مطابق) کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ امید ہے مودودی صاحب اس سے متفق ہونگے۔ اور یہ نہیں مانتے ہونگے کہ رسول اللہؐ کی زندگی تک تو وہ حضرات واقعی ایسے تھے لیکن بعد میں وہ (معاذ اللہ) ایسے نہیں رہے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے جب ان کے لئے جنت اور مغفرت کی شہادت دیدی، تو یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ایسے ہی رہے ہونگے۔ ورنہ خدا کی یہ شہادت بے معنی ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد آگے چلئے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳)

اور جو شخص ارادۃً کسی مومن کو قتل کرے۔ تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب ہوگا۔ اور اس کی لعنت! اور وہ اس کے لئے سخت عذاب تیار کرے گا۔

بات بڑی صاف ہے اور کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

مودودی صاحب جنگ جمل کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

بہرحال یہ جنگ برپا ہوکر رہی اور اس میں دونوں طرف کے دس ہزار آدمی شہید ہوئے ..... حضرت علیؓ کے ہاتھوں (مخالفین کے) پانچ ہزار آدمی شہید اور ہزاروں آدمی مجروح ہوئے (ترجمان القرآن - جون ۱۹۶۵ء صفحہ ۵۰)

ظاہر ہے کہ اس جنگ میں دونوں طرف صحابہؓ تھے۔ اور صحابہؓ میں بھی ایسے جلیل القدر ـــ مثل حضرت عائشہؓ - حضرت طلحہؓ - حضرت زبیرؓ - اور دوسری طرف حضرت علیؓ (رضی اللہ عنہم)

مودودی صاحب سے ہمارا سوال یہ ہے کہ جس تاریخ کو آپ پیش کر رہے ہیں اگر وہ اس قدر ثقہ اور ناقابلِ تردید ہے، تو آپ کا ان ہزارہا صحابہؓ کے متعلق کیا فیصلہ ہے جو اس جنگ میں شریک ہوئے اور جن کے ہاتھوں دس ہزار آدمی (بقول آپ کے) "شہید" ہوئے ـــ کیا یہ (آپ کی پیش کردہ "تاریخ کی رُو سے) ایک دوسرے کا قتل عمد نہیں تھا؟ فرمائیے کہ اس باب میں خدا کی اس شہادت کو سچا تسلیم کیا جائے جس کی رُو سے اس نے ان صحابہؓ کو پکّے اور سچّے مومن اور جنت کا وارث بنایا ہے، یا تاریخ کی اس شہادت کو جس کی رو سے (معاذ اللہ ـ معاذ اللہ) یہ سب اس جرم عظیم کے مرتکب ہو جاتے ہیں جس کی وعید خدا نے اس طرح کی ہے۔

پھر قرآن نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں جنگ پر اتر آئیں تو ان میں صلح کرا دو۔ اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے (اور صلح کے لئے آمادہ نہ ہو تو) جو زیادتی کرے اس کے خلاف جنگ کرو تاآنکہ وہ خدا کے حکم کے سامنے اپنا سر جھکا دے (۴۹/۹)

سوال یہ ہے کہ (آپ کی پیش کردہ تاریخ کی رو سے) جب جنگ جمل ہوئی تھی (یا اس کے بعد جنگ صفین) تو اُس وقت وہ جماعتِ مومنین کہاں تھی جس کا فریضہ خدا نے یہ قرار دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جنگ کرنے والے گروہوں میں صلح کرا دے! آپ کی پیش کردہ تاریخ سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اُس وقت اس جماعت کا وجود ہی باقی نہیں رہا تھا ـــ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرا سوال۔

حضرت عثمانؓ تیسرے خلیفہ تھے۔ صحابہ کبارؓ میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ ظاہر ہے مودودی صاحب ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

اب ہم اختصار کے ساتھ اُن مراحل کا جائزہ لیں گے جن سے گذرتے ہوئے یہ خلافت آخر کار ملوکیت میں تبدیل ہوئی، اور یہ بتائیں گے کہ اس تغیر نے مسلمانوں

کی ریاست کو اسلام کے اصولِ حکمرانی سے کس قدر ہٹا دیا اور اس کے کیا اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر مترتب ہوئے۔

اس تغیّر کا آغاز ٹھیک اُسی مقام سے ہُوا جہاں سے اُس کے رُونما ہونے کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ اپنی وفات کے قریب زمانے میں سب سے بڑھ کر جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ یہی تھی کہ کہیں اُن کا جانشین اپنے قبیلے اور اپنے اقربا کے معاملہ میں اُس پالیسی کو نہ بدل دے جو اُنہوں نے اور اُن سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کر رکھی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنے قبیلے اور خاندان کے کسی شخص کو حکومت کا کوئی عہدہ نہ دیا تھا، اور حضرت عمرؓ نے خود اپنے دس سال کے عہد میں بنی عدی کے صرف ایک شخص کو ایک چھوٹے سے عہدے پر مقرر کیا تھا؛ یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے میں قبائلی عصبیتوں کو سر اٹھانے کا کوئی موقع نہ ملا۔ انہیں خوف تھا کہ یہ پالیسی اگر بدل دی گئی تو سخت فتنے کی موجب ہوگی۔ اسی لئے انہوں نے اپنے تینوں متوقع جانشینوں ـــ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ـــ کو الگ الگ بلا کر ان کو وصیت کی تھی کہ اگر میرے بعد تم خلیفہ ہوئے تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو مسلمانوں کی گردنوں پر مسلّط نہ کر دینا۔ لیکن اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ انہوں نے پے در پے بنی امیہ کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں بدتِ اعتراض بن کر رہیں۔ سعدؓ بن ابی وقاص کو معزول کر کے انہوں نے کوفے کی گورنری پر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عُقبہ بن ابی مُعیط کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعد بن عاص کو دیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہؓ بن عامر کو ان کی جگہ مامور کیا۔ حضرت عمرو بن عاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہ سیدنا عمر فاروق کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی گورنری میں شام، فلسطین، اردن اور لبنان کا پورا

علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے چچازاد بھائی مروان بن الحکم کو انہوں نے اپنا سکرٹری بنا لیا جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے دروبست پر اس کا اثر ونفوذ قائم ہوگیا اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے ۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۶۵ء۔ ۴۳-۴۴)

یہ اعزہ واقربا کس کیریکٹر کے تھے اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت سعد بن ابی وقاص کی جگہ جس ولید بن عقبہ کو کوفے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اس کے انتظام سے اول اول اہل کوفہ بہت مطمئن ہوئے مگر بعد میں یہ بات نکلی کہ وہ مے نوش ہے اور اس کے قصے مشہور ہونے لگے۔ آخرکار اس نے ایک روز نشے کی حالت ہی میں لوگوں کو صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا" اور پڑھاؤں" (ایضا صفحہ ۴۶)

ہم مودودی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر تاریخ کے یہ بیانات (بقول آپ کے) سچے اور قابل اعتماد ہیں تو کیا اس قسم کی حکومت کو خلافت راشدہ کہا جائے گا اور ایسے حاکم کو خلیفہ راشد؟ کیا حضرت عثمانؓ کا یہ عمل ایک معمولی سہو اور خطا قرار دیا جائے گا جس سے ان کی صحابیت اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا؟ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ ٹھیک وہی مقام تھا جہاں سے خلافت ملوکیت کی طرف منتقل ہوئی۔ اگر یہ ٹھیک وہی مقام تھا تو پھر حضرت عثمانؓ کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا؟ ذرا کھل کر بات کیجئے۔

تیسرا سوال

حضرت عمرو بن العاصؓ ایک جلیل القدر صحابی اور فاتح مصر ہیں۔ ان کی سیرت وکردار کے متعلق مودودی صاحب کی نہایت قابل اعتماد تاریخ کیا کہتی ہے اسے مودودی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے ۔ جب معرکۂ صفین میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی تو

اس وقت حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت معاویہ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھائے اور کہے هذا حكم بيننا و بينكم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے۔ اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے حضرت علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی ...... ہم مجتمع رہیں گے اور ان کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائے گا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائے گی،

(ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۶۵ء ص ۳۸)

اس پر مودودی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ایک محض جنگی چال تھی۔ قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود نہ تھا۔ (ایضاً)

آپ نے رسولؐ اللہ کے ایک جلیل القدر صحابیؓ کا کیریکٹر (مودودی صاحب کے قول کے مطابق) ملاحظہ فرما لیا۔ لیکن اسی پر بس نہیں۔ ذرا آگے بڑھئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ طے پا گیا کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن عاصؓ اور حضرت علیؓ کی طرف .....

سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حکم مقرر ہوئے اور طے یہ پایا کہ جس فیصلہ پر یہ دونوں حضرات پہنچیں، وہ فریقین کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ چنانچہ دونوں حضرات ایک متفق فیصلہ پر پہنچ گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت اشعریؓ سے کہا کہ جس فیصلہ پر ہم دونوں پہنچے ہیں، آپ اس کا اعلان پہلے کر دیجئے۔ بعد میں، میں اس کی تائید کر دوں گا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری اٹھے اور اعلان کیا کہ

> میں اور میرے دوست (عمرو بن العاصؓ) ایک بات پر متفق ہو گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہم علی اور معاویہ کو الگ کر دیں۔ اور لوگ باہمی مشورہ سے جس کو پسند کریں اپنا امیر بنا لیں۔ لہٰذا میں علی اور معاویہ کو معزول کرتا ہوں (ایضاً ص ۴۰)

اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ اٹھے اور کہا۔

> ان صاحب نے جو کچھ کہا وہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی (حضرت علیؓ) کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی ان کی طرح انہیں معزول کرتا ہوں اور اپنے آدمی (حضرت معاویہؓ) کو قائم رکھتا ہوں۔ (ص ۴۰)

اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا مالك لاوفقك الله غدرت وفجرت۔ یہ تم نے کیا کہا۔ خدا تمہیں توفیق نہ دے۔ تم نے دھوکا دیا اور عہد کی خلاف ورزی کی۔

ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کا، آپ کے نزدیک کیریکٹر یہ ہو۔ یعنی وہ دیدہ دانستہ، دھوکا دینے کے لئے قرآن جیسی مقدس کتاب کو ڈھال بنانے سے نہ چوکے، اور بھری محفل میں، ایک متفق علیہ فیصلے سے، اس دیدہ دلیری کے ساتھ پھر جائے۔ کیا اس شخص کی (معاذ اللہ) ذرہ برابر عزت بھی کسی کی نگاہ میں رہ سکتی ہے؟ کیا آپ، اس کے بعد، ایمانداری سے

کہ سکتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کی صحابیانہ عظمت اور بزرگی آپ کے دل میں بدستور قائم ہے؟ اس پر مودودی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں۔

> کوئی غلط کام محض شرفِ صحابیت کی وجہ سے مشرف نہیں ہو جاتا بلکہ صحابی کے بلند مرتبہ کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس پر رائے زنی کرنے والے کو لازماً یہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ غلط کو صرف غلط سمجھنے اور کہنے پر اکتفا کرے۔ اس سے آگے بڑھ کر صحابی کی ذات کو بحیثیت مجموعی مطعون نہ کرے۔ (ص ۴۲)

ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے متعلق جو دو واقعات آپ نے لکھے ہیں کیا انہیں اُن کی محض "غلطی" سمجھا جائے گا یا (معاذاللہ) کبیرہ کی انتہائی پستی کا ثبوت قرار دیا جائے گا؟ اگر آپ ایک صحابی کا کبیرہ (استغفراللہ) یہ بتاتے ہیں۔ تو پھر صحابی کی وہ "ذات" کونسی ہوگی جسے مطعون نہ کرنے کی آپ اسقدر تاکید فرما رہے ہیں؟

ایک واقعہ اور ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت معاویہؓ نے جس طرح اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے بیعت لی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

> اس تجویز کی ابتدا حضرت مغیرہ بن شعبہ کی طرف سے ہوئی۔ حضرت معاویہ انہیں کوفے کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں اسکی خبر مل گئی۔ فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ "صحابہ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیرالمومنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں۔ یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا۔ انہوں نے حضرت مغیرہ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جو تم نے یزید سے کہی۔ حضرت مغیرہ نے جواب دیا "امیرالمومنین آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمان کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے۔ اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو۔" حضرت معاویہؓ نے پوچھا "اس کام کو پورا کرا دینے کی ذمہ داری کون لے گا؟" انہوں نے کہا "اہل کوفہ کو میں سنبھال لونگا اور اہل بصرہ کو زیاد۔ اسکے بعد

پھر اور کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے" یہ بات کر کے حضرت مغیرہ کوفہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے کہیں۔ یہ وفد حضرت مغیرہ کے بیٹے موسیٰ بن مغیرہ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ بعد میں حضرت معاویہ نے موسیٰ کو الگ بلا کر پوچھا "تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے؟" انہوں نے کہا ۳۰ ہزار دینار، اس پر حضرت معاویہ نے کہا "تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت جولائی ۱۹۶۵ء صفحہ ۴۷)

مودودی صاحب یہ کچھ بھی لکھتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرماتے جاتے ہیں کہ دیکھنا! ان صحابیوں کی صحابیت، عظمت اور بزرگی کے خلاف تمہارے دل میں کوئی خیال تک نہیں گذرنا چاہیئے۔

چوتھا سوال

حضرت معاویہؓ کے برسرِ اقتدار آنے کے سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

وہ خلیفہ ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی۔ مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا۔ وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۲)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے نزدیک، حضرت معاویہؓ کس طرح برسرِ اقتدار آئے تھے؛ لیکن اس کے بعد ہوا کیا؟

تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے امت نے ان کی بیعت پر اتفاق کر لیا۔

(ایضاً)

یعنی ایک (معاذ اللہ) غاصب اور مستبد کی بیعت پر تمام صحابہ، تابعین۔ اور صلحائے امت راضی ہو گئے۔ انا للہ و انا علیہ راجعون! یعنی مودودی صاحب تو آج تک کسی ایک ایسی حکومت سے بھی راضی نہیں ہوئے جسے یہ (بزعم خویش) غلط کار سمجھتے ہوں، اور اپنے اس کردار کو بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں — لیکن ان کے ارشاد کے مطابق، تمام صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت،

ایک ایسی حکومت سے راضی ہو گئے جسے مودودی صاحب بھی صحیح اسلامی حکومت قرار نہیں دیتے حضرت معاویہؓ کو تو چھوڑیئے۔ اس سے اس زمانہ (یعنی رسول اللہؐ کے تیس ہی سال بعد) کے تمام صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت کی پختگی ایمان کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ قابل غور ہے۔

مودودی صاحب نے اس کی مصلحت یہ بتائی ہے کہ

اگر اسوقت ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ (حضرت معاویہؓ) اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خوں ریزی و بدنظمی تھے جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ (ایضاً)

اگر خوں ریزی اور بدنظمی اتنی بری خرابی ہے، جس سے بچنے کے لئے ایک غاصب اور مستبد کی حکومت پر راضی ہو جانا کوئی جرم نہیں قرار پاتا تو اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پھر حضرت علیؓ نے بھی یہی مسلک کیوں نہ اختیار کیا اور کیوں ایسی جنگوں میں الجھ گئے جن میں ہزارہا انسانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا اور ہر طرف بدنظمی ہی بدنظمی پھیل گئی، تو مودودی صاحب کیا جواب دیں گے۔؟ اور اگر حضرت علیؓ (اور آپ کے بعد امام حسینؓ) کا مسلک صحیح تھا (کہ ایک غلط حکومت پر راضی نہیں ہونا چاہیئے خواہ اس میں کتنی خوں ریزی کیوں نہ ہو) تو پھر آپ ان تمام صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت (مع امام حسنؓ) کے متعلق کیا فرمائیں گے جو حضرت معاویہؓ کی بیعت پر راضی ہو گئے۔

پانچواں سوال

حضرت معاویہؓ کا اسم گرامی مودودی صاحب نے یوں تحریر فرمایا ہے۔

(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، اگست ۶۵ء، ص ۳۲)

گویا مودودی صاحب کو اس کا اعتراف ہے کہ حضرت معاویہؓ سے خدا راضی تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ آپ صحابہؓ میں سے تھے اور رسول اللہؐ کے کاتب۔

اپنی حضرت معاویہؓ کے متعلق مودودی صاحب نے (اس تاریخ کے حوالے سے جسے وہ بڑی معتبر اور قابل اعتماد قرار دیتے ہیں) لکھا ہے

(۱) انہوں نے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی۔

(۲) انہوں نے بزور شمشیر اور امت کی رضامندی کے خلاف، حکومت حاصل کی اور اسے بزور شمشیر قائم رکھا۔

(۳) جو لوگ حضرت علیؓ کی تعریف کرتے تھے انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور قتل کر دیا

جاتا تھا۔ چنانچہ اس پالیسی کے ماتحت حضرت حجر بن عدی کو، جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے امت میں ایک اونچے مرتبے کے شخص تھے، (ان کے سات ساتھیوں کے ساتھ) قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک کو زندہ دفن کر دیا۔ (اگست ۶۵ء)

(۴) رسولؐ اللہ کی سُنّت اور خلفائے راشدینؓ کے مسلک کے خلاف، انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ (ستمبر ۶۵ء)

(۵) دیت کے معاملہ میں انہوں نے رسولؐ اللہ کی اس سُنّت کو بدل دیا جس کی رو سے معاہد کی دیت مسلمان کے برابر قرار دی جاتی تھی۔ (〃)

(۶) مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سُنّت رسولؐ اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ یعنی وہ اس میں سے چاندی اور سونا تو اپنے لئے نکال لیتے تھے اور باقی مال تقسیم کر دیتے تھے (ایضاً)

(۷) زیاد بن سمیہ، (زمانہ قبل اسلام میں) حضرت ابوسفیان کا ولد الحرام تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اسے اپنا بھائی قرار دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ (ایضاً)

(۸) انہوں نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا۔ مثلاً جب کوفے کے گورنر زیاد پر کچھ لوگوں نے خطبہ کے دوران پتھر پھینکے تو انہوں نے ان تمام لوگوں کے (جن کی تعداد تیس سے اسی تک بیان کی جاتی ہے) ہاتھ کٹوا دیئے۔ دربار خلافت سے گورنر کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ (ایضاً)

(۹) چھوٹے چھوٹے بچوں کا قتل۔ (〃)

(۱۰) مسلمان عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہوتی تھیں، انہیں لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ (〃)

(۱۱) دشمنوں کے سر کاٹ کر ان کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ اُسے ان کی بیویوں کی گود میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ان کی لاش گدھے کی کھال میں رکھ کر اسے جلا دیا جاتا تھا۔ ان کی لاشیں کئی کئی روز تک سولی پر لٹکتی رکھی جاتی تھیں۔ یہ وہ سلوک ہے جسے اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی روا نہیں رکھا۔

(ستمبر ۶۵ء)

(۱۲) انہوں نے سیاست کو دین پر بالا رکھا اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑ ڈالیں پھر اپنے بعد، یزید جیسے شخص کو اپنا ولی عہد بنایا۔ (〃)

اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ

حضرت معاویہؓ کے محامد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں۔ ان کا شرف صحابیت بھی واجب الاحترام ہے۔ ان کی یہ خدمت بھی ناقابل انکار ہے کہ انہوں نے پھر سے دنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور دنیا میں اسلام کے غلبے کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا۔ ان پر جو شخص بھی طعن کرتا ہے وہ بلا شبہ زیادتی کرتا ہے۔ لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہوگا۔ اسے صحیح کہنے کے یہ معنی ہونگے کہ ہم اپنے صحیح و غلط کے معیار کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

(جولائی ۶۵ء)

معلوم نہیں یہ لکھ کر مودودی صاحب کسے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔

بہرحال یہ ہیں، مودودی صاحب کے بیان کے مطابق وہ (حضرت) معاویہ (رض) جن کے متعلق انہوں نے خود لکھا ہے کہ رضی اللہ عنہ۔ ان سے خدا راضی تھا۔ جنہوں نے رسول اللہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جو حضورؐ کے کاتب تھے۔

اور یہ تھے وہ (حضرت) معاویہ (رض) جن کی اس حکومت پر تمام صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت راضی تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے تھے لیکن اس حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک نہیں لاتے تھے۔ (اس لئے کہ اگر کسی شخص نے کچھ کہا تو اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا تھا)۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ تمام صحابہ، تابعین اور صلحائے امت سب کچھ "دیکھتے" تھے لیکن ڈر کے مارے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے (یعنی وہ تھا حاکم وقت کا کیریکٹر۔ اور یہ تھا ان محکوموں کا کردار!)۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو جس درخت کے پھل اس قسم کے ہوں، اس درخت کے متعلق (معاذ اللہ) کیا کہا جائے گا، تو مودودی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے؟

اور اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مسلمانوں کا خدا اسی قسم کے لوگوں سے راضی ہو کر ان کے لئے جنت کی ضمانت دے دیتا ہے، تو مودودی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے؟

مودودی صاحب نے اس داستان کو کس مقصد کے لئے چھیڑا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں

کرسکتے۔ لیکن جس تاریخ کو وہ اس قدر قابل اعتماد قرار دے کر اس فخر کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کی طرف ہم ابھی ابھی اشارہ کرچکے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے یہ اس قدر اہم فریضہ اس لئے اپنے ذمے لیا ہے کہ اگر ہم اپنی تاریخ کو اس کے اصلی رنگ میں پیش نہ کریں، تو مسلمانوں کی نئی نسل اس تاریخ سے متاثر ہوجائے گی جسے مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

ان سے کوئی پوچھے کہ آپ نے اپنی اس تحقیق انیق کے بعد صدر اول کے مسلمانوں کا جو نقشہ کھینچا ہے، کیا کوئی متعصب ترین مستشرق اس عہد کی اس سے بدتر تصویر کھینچ سکتا تھا؟ کیا یہی ہے وہ نقشہ جس سے آپ نئی نسل کے مسلمانوں کو غیروں کے زہر آلود تاثرات سے بچانا چاہتے ہیں!

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ہم اس تاریخ کو ناقابلِ اعتماد قرار دیدیں تو پھر ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد کے جو درخشندہ واقعات دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کی سند کیا ہوگی۔ ہمیں یا تو اس ساری کی ساری تاریخ کو قبول کرنا ہوگا۔ یا ساری کی ساری کو رد کردینا ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا منطقی مغالطہ ہے۔

مسلمان کی پوزیشن یہ ہے کہ اس کا قرآن پر ایمان ہوتا ہے۔ قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو کچھ کسی متعلق کہہ دیا ہے اس کے سچے اور برحق ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہوسکتا۔ اگر قرآن کریم کی بیان کردہ کسی حقیقت کے خلاف (بفرض محال) دنیا بھر کی شہادات بھی اکٹھی ہوجائیں تو ہم ان شہادات کو پرکاہ جتنی وقعت بھی نہیں دیں گے۔ قرآن کریم نے جن حضرات (صحابہ کبارؓ) کے مومن حقا ہونے کی شہادت دی ہے اور جن کی مغفرت کی سند عطا کی ہے۔ اگر تاریخ کی کسی کتاب میں ان کے خلاف کوئی ایسی بات ہوگی جس سے ان شہادات پر حرف آتا ہو تو ہم اس تاریخ کو دیوار پر دے ماریں گے خواہ اس کا مصنف کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ کتاب اللہ کے مقابلہ میں کسی طبری کسی ابن کثیر کسی ابن الاثیر کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تو عام تاریخ کی کتابیں ہیں۔ اگر حدیث کی کسی کتاب میں بھی کوئی بات ایسی ہو جس سے رسول اللہ کی سیرتِ طیبہ یا صحابہ کبارؓ کی ذات پر کسی طرح کا طعن پڑتا ہو، تو ہم اسے بھی قابلِ قبول نہیں سمجھیں گے۔ وضعی قرار دیں گے۔ قرآن کریم نے مومنین کی خصوصیات بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہیں۔ صحابہ کبارؓ مومنین کی بلند ترین جماعت تھی۔ (معمولی سہو و خطا کی بات اور ہے) ان میں سے کسی کا کوئی عمل ایسا نہیں ہوسکتا جو ان بنیادی خصوصیات کے خلاف ہو۔ یہ ہے وہ معیار جس کے مطابق ہمیں عہد محمد رسول اللہ

والذین معہ کی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنا چاہیئے۔ جو شخص بھی اس عظیم خدمت کو سرانجام دے گا وہ امت کا محسن اور اسلام کا سچا خادم ہو گا۔ اور یہی ہو گی وہ تاریخ جس سے ہماری نئی نسلوں کے سامنے اسلام کی عملی تشکیل کا صحیح نقشہ آئے گا۔ یہ کام نہ تو ان لوگوں سے ہو سکے گا جو تاریخ کی موجودہ کتابوں کو وحی الٰہی کی طرح منزہ عن الخطا سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہی ان سے جو تاریخ کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ کے متعلق ہمارے اس معیار کو دنیا کا کوئی مؤرخ تسلیم نہیں کرے گا (کہ ہماری کتب تاریخ میں جو واقعات ایسے ہوں جن سے صحابہ کبارؓ کی عظمت ثابت ہوتی ہو اسے ہم صحیح قرار دیں اور جن سے ان کی سیرت و کردار پر حرف آتا ہو اسے مسترد کر دیں) تو ہم گذارش کریں گے کہ ہم دنیا کے مورخین کی خاطر قرآن پر اپنے ایمان کو کس طرح چھوڑ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب وحی کا سوال سامنے آئے گا تو ہماری پوزیشن بالکل منفرد ہو جائے گی۔ مثلاً اگر آج دنیا بھر کے مورخ مل کر یہ کہدیں کہ مصر کی تاریخ میں حضرت یوسفؑ کے نام کی کوئی شخصیت نہیں ملتی، یا حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش کی تاریخی حیثیت کچھ نہیں تو کیا ہم ان کے کہنے سے قرآن کریم کے ان بیانات سے انکار کر دیں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ اگر کوئی مورخ کہے کہ یہ انداز مورخانہ اور محققانہ نہیں کہ آپ قرآن میں بیان کردہ واقعات کو بالکل سچا تسلیم کر لیں، تو ہم اس کے اس اعتراض کی بنا پر اپنے نقطۂ نگاہ کو نہیں بدل سکیں گے۔ ہمارا کام یہ ہو گا کہ ہم قرآن میں بیان کردہ حقائق کو علم و بصیرت کی رو سے صحیح ثابت کریں۔ لیکن اگر ہماری تاریخ کے بعض واقعات قرآن کو جھٹلاتے ہوں تو ہم اس تاریخ کو چھوڑ دیں گے۔ قرآن کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔

بالآخر اس تاریخ کی اس سے زیادہ حیثیت کیا ہے کہ اس عہد ہمایوں سے دو تین سو سال بعد زبانی روایات کی بناء پر بعض لوگوں نے انفرادی طور پر تاریخ مرتب کر دی۔ ان کی اس کوشش کا قرآنی حقائق سے کیا مقابلہ؟ ہمیں قرآن کریم کو معیار قرار دے کر عہد محمد رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنا چاہیئے تاکہ کوئی مورخ، ہماری موجودہ تاریخ کو بطور سند پیش کر کے، ہمارے خلاف حجت نہ لا سکے۔ باقی رہے اس دور کے بعد کے مسلمان تو ان پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف نہیں ہیں۔ اس لئے اگر تاریخ کے کسی واقعہ سے انکی کسی خرابی کی نشاندہی ہوتی ہے، تو اس کے ذمے وار وہ خود ہیں۔ ہمیں انکی وکالت کی ضرورت نہیں ہو گی۔

ہم مودودی صاحب سے گذارش کریں گے کہ امت کا جو قرض آپ کے ذمے ہے، براہ کرم آپ اسے اس طرح ادا کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ اس سے تو امت بیچاری الٹی زیر بار ہو جائے گی۔

آپ کی اس "احسان شناسی" کے متعلق ہم اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں کہ

کرم کیا بھی تو اس ستم کا جو اور مجھ کو تباہ کر دے
تمہارے ان آنسوؤں کے صدقے طریق غدر جفا یہی ہے؟

احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو اصول اور احکام آئے ہیں وہ سب غیر متبدل ہیں۔ اسلامی حکومت انہیں علیٰ حالہٖ نافذ کرے گی۔ لیکن جن اصولوں کی قرآن کریم نے جزئیات خود متعین نہیں کیں، ان کی جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہر دور کی اسلامی حکومت خود مرتب کرے گی۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات میں عند الضرورت ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہم نے مملکتِ پاکستان کے لئے اسی اصولِ "قانون سازی" کو پیش کیا اور اسی کی ہم مسلسل دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں۔

شروع شروع میں اس دعوت کی سخت مخالفت ہوئی کیونکہ ہمارا قدامت پسند، تقلید پرست طبقہ، جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو کفر و الحاد قرار دیتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب رفتہ رفتہ تعصب کے یہ بادل چھٹتے جا رہے ہیں اور خود انہی میں کا معقول پسند طبقہ رفتہ رفتہ اسی مسلک کی طرف آ رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا محمد تقی صاحب کا شمار ملک کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ عنوان بالا سے ان کا ایک طویل مقالہ، دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ برہان کی متعدد اشاعتوں میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ہم اس مقالہ کو (برہان کے شکریہ کے ساتھ) اپنے ہاں بالاقتباس شائع کر رہے ہیں۔ جس سے یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آ جائے گی کہ اب ہوا کا رخ کس سمت کو ہے۔ اس مقالہ کے بعض مقامات مزید وضاحت چاہتے ہیں، اور بعض نکات سے ہمیں اختلاف ہے۔ مقالہ ختم ہو جانے کے بعد ہم ایسے مقامات کے متعلق استدراک میں تفصیل سے لکھیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام، اس مقالہ اور ہمارے استدراک کو مفید پائیں گے۔

اقتباسات میں ہم نے عربی عبارات کو حذف کر کے ان کے اردو ترجمہ اور اصل حوالہ پر اکتفا کیا ہے۔

(طلوعِ اسلام)

۷۸۶

احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

(مولانا محمد تقی صاحب امینی، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ)

معاشرہ کی حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی ہے، بلکہ اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہ تبدیلی کبھی معمولی ہوتی ہے جو حالات کے آثار چڑھاؤ سے رونما ہوتی ہے اور کبھی ہمہ گیر ہوتی ہے جو ایک دور کے بعد دوسرے کے آنے سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

پہلی صورت میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ چند احکام و مسائل کے موقع و محل میں تبدیلی سے کام چل جاتا ہے۔

لیکن دوسری صورت میں چند مسائل پر بات نہیں ختم ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے قانونی نظام کو نئے انداز میں ڈھالنے اور نئے قوانین وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

معاشرے میں جب توانائی ہوتی ہے اور رہنماؤں میں صلاحیت کے ساتھ ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے تو ترتیب و تدوین کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے، لیکن جب معاشرہ کمزور و ناتواں ہوتا ہے، ادھر رہنماؤں میں بحیثیت مجموعی قومی و ملی مفاد کا شدید احساس نہیں ہوتا ہے یا ذاتی و گروہی اقتدار کے تحفظ کی زیادہ فکر ہوتی ہے تو مذکورہ کام میں بڑی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور ایک عرصہ تک مستقل و مسلسل جد و جہد کے بغیر کام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔

مسلم قوم کے زوال نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے

مسلم قوم کے زوال نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے جس کے نظریات نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور معاشرہ کی جدید تشکیل نے مذہب و زندگی کے ہر شعبہ میں بیشمار نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

پہلے جو کام ایک گوشہ میں ہوا کرتا تھا اب اس کے لئے ایک وسیع دنیا وجود میں آگئی ہے، پہلے ایک فرد کی صلاحیت کافی ہوتی تھی اب تقسیم کار کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے، پہلے تجدید دین کی بات ایک معاشرہ تک محدود تھی اب اس کا تعلق ایک "دور" سے ہوگیا ہے۔

ایسی حالت میں کسی ایک تنظیم و تحریک سے ملّت کی تمام ضرورتوں کو وابستہ کرنا کس قدر ناتجربہ کاری ہے، اور خود تنظیم و تحریک کا ملّت کے ہر گوشہ میں رہنمائی کا مدعی بننا کس قدر خود فریبی ہے ؟

جو جس کا میدان ہے بس اسی تک اپنی جولانیوں کو محدود رکھے اگر کسی اور میدان میں دست درازی کا ارادہ ہو تو پہلے سے سبکدوشی کا اعلان کر دے ورنہ کام کسی میدان میں نہ ہوگا اور نام ہر ایک کی فہرست میں آجائے گا۔

قوم و ملت کو اپنے رہنماؤں سے یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ ان کے پیشِ نظر کام ہے محض نام نہیں ہے،

مسلم قوم کی موجودہ حالت

اس وقت مسلم قوم کا حال ایک ایسے مریض کا ہے کہ جس کے آثارِ صحت نمایاں ہیں لیکن کمزوری بدستور باقی ہے، جب کوئی مریض رُو بصحت ہوتا ہے تو صرف دواؤں سے کام نہیں چلتا ہے بلکہ معتدل انداز میں غذا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر اس کو غذا نہ پہونچائی گئی تو نقاہت کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جائے گا، اور پھر دوا پینے سے بھی انکار کر دے گا۔

اور اگر خدانخواستہ ضد میں آکر طبیب کی ہدایت کے خلاف خود ہی غذا استعمال کرنے لگا تو بدپرہیزی کی وجہ سے اس کی زندگی کا جو حشر ہوگا وہ الگ رہا سوچنے کی بات یہ ہے کہ پھر طبیب و تیماردار کا کیا مصرف باقی رہے گا ؟ جب شاخ ہی پر دوسروں کا قبضہ ہو جائے تو آشیانہ کیسے برقرار رہے گا۔ ؟

جب وہ توانا تھی تو اس کو نئی غذا کی ضرورت نہ تھی

جس وقت مسلم قوم قوی اور توانا تھی اس وقت نئی غذا کی ضرورت تھی اور نہ موجودہ غذاؤں کے لئے نئے ڈبے اور پیکٹ درکار تھے بلکہ ملکی اور معاشرتی قوانین کا جو ذخیرہ موجود تھا وہ وقت اور موسم کے لحاظ سے کافی تھا اور حسب ضرورت استعمال کرنے میں آزادی تھی،

پھر ایسے حالات سے دوچار ہوئی کہ اس کی زندگی کا سب کچھ لُٹ گیا وہ بیمار ہوئی اور بیماری آخری ڈگری تک پہونچ گئی، لیکن چونکہ اس کی روح میں وحی الٰہی کی آواز سرایت تھی اس بناء پر جان بچانے میں کامیاب ہوگئی۔

اس اثناء میں دوسری ضعیف و ناتواں قوم اس کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلو سے روشنی اور عبرت حاصل کر کے قوی و توانا بن گئی، اُس نے زمانہ کا رُخ موڑا اور ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

اب جبکہ مسلم قوم نے روبصحت ہو کر زندگی میں دوبارہ قدم رکھنا چاہا تو وہ دور ختم ہو چکا ہے جس کا آغاز خود اس نے کیا تھا اور وہ دنیا لُٹ چکی ہے جس کو اپنے ہاتھوں بنایا اور سجایا تھا۔

پچھلا دور اپنی شکل میں پھر واپس نہیں آتا ہے

قانون فطرت کے مطابق کوئی "دور" اس طرح نہیں ختم ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس لئے نہیں لٹتی ہے کہ وہ اپنی حالت پر پھر آباد کی جائے، یہ دنیا عالم کون وفساد ہے یہاں ہر بگاڑ کے ساتھ بناؤ اور ہر تخریب کے ساتھ تعمیر ہے، خود فطرت ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ کرتی ہے، اور خوب سے خوب نئی نئی کونٹ کرتی ہے، جب کوئی شئے ایک جگہ نٹ ہوگئی تو کمتر شئے کے لئے وہ جگہ نہ چھوڑے گی بلکہ قبضہ کے لئے اس سے بلند و برتر شئے کا ہونا ضروری ہے۔

اس بنا پر یہ توقع فضول ہے کہ سابق دور واپس آئے گا اور اس کے معاشرہ میں ملکی و معاشرتی قانون علی حالہ نافذ ہوں گے۔ (سابق دور سے مراد اس کی عمارت ہے نہ کہ معنوی و روحانی خصوصیت کہ جس کی واپسی ہی میں فلاح عالم کا مدار ہے)۔

نئی دنیا کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے

جس نئی دنیا میں اس نے قدم رکھا ہے اگر اس میں رہنا اور چلنا ہے (اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے) تو اس کے احساسات و خیالات کو سمجھنا ضروری ہے اور تقاضوں و مطالبوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے۔ حصول مصالح اور دفع مضرت کی بہت سی شاہراہیں تعمیر ہو چکی ہیں، معاشی اسکیموں اور فلاحی تجویزوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے، صنعت و حرفت کی وسیع پیمانہ پر تنظیم ہوگئی ہے اور تجارت وغیرہ کی نئے انداز میں تشکیل ہو چکی ہے۔

بات صرف حاجت و ضرورت پر نہیں ختم ہوتی ہے بلکہ جلب منفعت اور دفع مضرت کا سوال ہے اور زندہ رہنے کے لئے زندگی کے موجودہ سروسامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے،

ملکی و معاشرتی قوانین میں اضافہ اور تبدیلی کی ضرورت ہے

ادھر ہمارے ملکی و معاشرتی قوانین میں بعض ایسے ہیں جن کا دور ختم ہو چکا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کی دنیا لٹ چکی ہے اور بہت سے وہ ہیں جن کے لئے نیا قالب تیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے،

نیز موجودہ دور کے بہت سے قوانین اپنے ذخیرہ میں شامل ہونے کے لائق ہیں اور بہت سے معاملات کے لئے نئے قوانین وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

قانون کی ترتیب و تنظیم کا یہ کام اگر معاشرتی تبدیلی کے اتار چڑھاؤ سے متعلق ہوتا تو زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہ تھی، چند احکام و مسائل کے موقع و محل میں تبدیلی سے کام چل جاتا اور اس کے ذریعہ وقت کی ضرورتیں پوری ہوتی رہتیں جیسا کہ تاریخ میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

لیکن اس وقت کا کام مستقل دور کی تبدیلی سے متعلق ہے اس بناء پر چند مسائل کے الٹ پھیر سے بات نہ بنے گی، بلکہ فروعی نظام میں ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کے ساتھ اس کو جدید انداز میں ڈھالنا ہے۔ اور

اصول نظام کی حفاظت کے ساتھ اس کو نئی ترتیب و تنظیم کا جامہ پہنانا ہے، ظاہر ہے یہ کام مستقل اور مسلسل جدوجہد کے بغیر نہیں انجام پا سکتا ہے۔

معاشرہ شریعت سازی کی بنیاد ہے

"معاشرہ" شریعت سازی کی بنیاد ہے اور احوال و مصالح عمارت تعمیر کرنے کے سامان، جب معاشرہ میں تبدیلی ہو گی تو لازمی طور پر سے احکام شرعیہ کی شکل و صورت بدلے گی۔ اور جب احوال و مصالح باقی نہ رہیں گے تو ان سے بنی ہوئی عمارت بھی ختم ہو جائے گی۔

ہدایت الٰہی نے ہمیشہ "شرائع" کے نزول میں بنیاد و سامان دونوں کا لحاظ کیا ہے اور اسی وجہ سے شرائع و مناہج کے اختلاف کو برقرار رکھا ہے۔

ہدایت کے بنیادی قواعد میں نئے احوال و ظروف کی جگہ موجود ہے

جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ان کا لحاظ نہ کیا گیا تو شریعت اور معاشرہ کا رشتہ منقطع ہو جائے گا، پھر شریعت زندگی سے کنارہ کشی پر مجبور ہو گی اور یا اس کی چاکری میں مشغول رہے گی۔

جب تک نزول شرائع کا سلسلہ جاری رہا ہدایت نے صرف زمانہ نزول کے معاشرہ کو اپنا مطمح نظر بنایا اور جب یہ سلسلہ بند ہوا تو ہدایت کے بنیادی قواعد میں تمام ان نئے احوال و ظروف کو بھی جگہ دی گئی جو بعد میں ظہور پذیر ہونے والے تھے، چنانچہ نزول ہدایت کے وقت عرب کا معاشرہ سادہ تھا، عقلی موشگافی اور تمدنی سج دھج کو اس میں دخل نہ تھا، سادہ ذہن کے مطابق احکام شرعیہ نہایت سادگی کے ساتھ عرب کے جسم و بدن پر فٹ آ گئے۔

لیکن جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور ایرانی، رومی، کلدانی، حبشی، قبطی، ترکستانی اور سندھی قومیں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئیں، یا زیر اقتدار آئیں تو وہ اپنا مخصوص معاشرہ اور تمدن ساتھ لائیں۔ ان کے عادات و معاملات مختلف تھے، معاشی و سیاسی نظام میں تفاوت تھا، کہیں ایرانی تہذیب و قانون کو دخل تھا تو کہیں رومی تمدن و قانون کا اثر۔ غرض ان سب کے اختلاط سے ایک عجیب کشمکش پیدا ہوئی۔ اور ان کے ساتھ معاملات سے نئی نئی ضرورتیں ابھریں اور بہت سے نئے مسائل حل طلب قرار پائے جن کی وجہ سے عرب کی سادگی کو دھکا پہونچا اور احکام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی دے کر ان کے دامن کو وسیع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

دور اول میں رہنمایان ملت کی رہنمائی

یہ وقت رہنمایان ملت کے لئے نہایت نازک اور دشوار گذار تھا، اگر خدانخواستہ ان پر جمود طاری ہوتا یا اسلام کو آزادی دینے والی قوت کے بجائے اس کو معطل کرنے والی آہنی زنجیر سمجھتے تو اسلام صرف عرب میں محدود ہو کر رہ جاتا اور ہمیشہ کے لئے اس کی عالمگیریت ختم ہو جاتی۔

لیکن فقہائے کرام کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ چین نصیب کرے انھوں نے جس انداز سے اسلام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے اور نئے احوال و ظروف کو جس ہمت کے ساتھ ہدایت کے وسیع دامن میں سمیٹا کہ قانون کی تاریخ

اور ملی خدمات میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

چنانچہ احکام و قوانین کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود و محفوظ ہے اس کی وسعت و تنوع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہارون الرشید کی سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی، وہ انہیں احکام و قوانین پر قائم تھی اور اس دور کے تمام واقعات و معاملات انہیں کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔

ہدایت کی پالیسی "امالہ" کی ہے "ازالہ" کی نہیں۔

معاشرتی یا نئے احوال و ظروف کی رہنمائی میں ہدایت الٰہی کی پالیسی "ازالہ" کی کبھی نہیں رہی، بلکہ ہمیشہ وہ "امالہ" ہی کی حکمت پر کاربند رہی ہے، یعنی تاریخ کے کسی دور میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے کہ "ہدایت" نے معاشرہ کے مروجہ احکام و مراسم یا مرغوبات و مالوفات کے بارے میں شمشیر بے نیام ہو کر فیصلہ کیا ہو کہ جو بات مروج دیکھی اس کو ختم کر دیا اور جو چیز لوگوں کی پسندیدہ ہوئی اس سے روک دیا بلکہ ہمیشہ اس نے لوگوں کی نفسیات اور مزاجی کیفیات کے پیش نظر اپنے لئے جو جامہ تیار کیا اس میں تقریباً وہی سب سامان لگایا جو مروج اور معاشرہ میں موجود تھا، پہلے اس نے روح پھونکی اور نقشہ میں اتارا پھر اپنے سانچہ میں ڈھال کر قبول کر لیا۔

عرب کا معاشرہ آخری ہدایت کا تشریعی مادہ ہے

دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، آخری ہدایت نے شریعت کے نام سے ملکی و معاشرتی قوانین کا جو جامہ تیار کیا ہے اس میں عرب کے معاشرہ ہی کی ساخت و پرداخت کو دخل ہے، جس طرح ہر زمانہ کا معاشرہ اس وقت کی ہدایت کا تشریعی مادہ ہوتا تھا، اسی طرح عرب کا معاشرہ آخری ہدایت کا تشریعی مادہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہدایت کے بنیادی قواعد میں بعد کی ہونے والی تبدیلیوں کو سمیٹنے کی نہ صرف گنجائش اور وسعت ہے بلکہ حوصلہ افزائی اور تاکید ہے کہ اس کے بغیر عالمگیریت پر حرف آتا ہے اور اسلام صرف ایک دور میں محدود ہو جاتا ہے۔

استفادہ کی بہت سی راہیں ہیں

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فقہائے کرام نے معاشرتی تبدیلیوں کو سمیٹ کر دکھایا اور ہر اس چیز کو قبول کیا جو قبول کرنے کے لائق تھی، ہر اس مالی و معاشی نظام سے استفادہ کیا جس سے استفادہ ملک و ملت کے لئے ضروری یا مفید تھا۔

پھر استفادہ کے سرچشمہ کو کسی ایک راستہ میں مقید نہیں کیا بلکہ قیاس، استحسان، استصلاح، اور استدلال وغیرہ بہت سی راہیں نکالی ہیں جن کی طرف اشارہ ہدایت کے بنیادی قواعد میں موجود تھا۔

مشرق کی رہنمائی کا دور ختم ہوا، اب مغرب کی رہنمائی کا دور ہے۔ یہ وہی مغرب ہے جس کی معاشرت پر بداوت غالب تھی، اور تہذیب و تمدن کی چمک دمک سے ناآشنا تھی۔

لیکن اس نے دور کے بدلنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، معاشرتی تبدیلیوں کے مقابلہ میں "دور" کی تبدیلی

زیادہ اہم اور دُور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے، چنانچہ عبادات و معاملات، معاشیات و سیاسیات، حدود و تعزیرات وغیرہ کا کوئی شعبہ اس کی زد سے محفوظ نہیں ہے۔

اپنی نااہلی و بے ہمتی کا قصور

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ابتداء میں عرب سے باہر قدم نکالتے ہی جن پُرآشوب حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا، آج تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے کہیں زیادہ حالات پُرآشوب ہیں۔ جس طرح مختلف ملکوں کے نظام اور قانون اُس وقت اسلام کو چیلنج کر رہے تھے اس سے سیکڑوں حصّہ زیادہ آج چیلنج کا سامان موجود ہے۔

ہمارے بزرگوں نے پُرآشوب حالات کا مقابلہ کرکے اور چیلنج کا جواب دے کر اُس وقت ساری دنیا کی رہنمائی کی تھی اور آج ہمارے سامنے صرف مسلم قوم کی رہنمائی کا مسئلہ ہے۔

دراصل ثبوت اپنی نااہلی اور قصور اپنی بے ہمتی کا ہے ورنہ ہدایت کا وسیع دامن اب بھی موجود ہے اور رہنمائی کے لئے قرآن و سنّت کی روشنی، صحابہؓ کی زندگی اور فقہاءؒ کا کارنامہ سب کچھ محفوظ ہے۔

رہنمائی سے استفادہ کی راہ میں چند دشواریاں

احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کے لئے جس قسم کی رہنمائی ملتی ہے اس کی تفصیلات سے پہلے چند دشواریوں کی نشاندہی ضروری ہے جو رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں حائل ہیں

۱۔ مذہب کی نمائندگی جس انداز سے ہو رہی ہے اس میں بڑی حد تک فکر و عمل کی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو دورِ زوال کی یادگار ہیں اور جن کو زمانی تبدیلیوں نے پائمال بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے لیکن ان شعبوں کی تعبیر و تفسیر میں اب تک دور و زمانہ کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

بلاشبہ بعض ذہین اور طباع حضرات کی قلمی جولانیاں مسلّم اور قابلِ قدر ہیں لیکن ان جولانیوں کا دائرۂ کار عقائد و عبادات سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اسی طرح بعض اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں شاذ و نادر انفرادی رایوں سے بھی انکار نہیں ہے لیکن سوادِ اعظم کی بارگاہ سے سندِ قبولیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ رائیں معاشرہ پر اثر انداز نہیں ہو سکی ہیں بلکہ صاحبِ رائے خود مورد الزام قرار پایا ہے۔

۲۔ ہر سمجھدار آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بہت سے ملکی، تنظیمی اور معاشرتی قوانین حالات و زمانہ کی رعایت کئے بغیر اپنی افادیت نہیں برقرار رکھتے ہیں لیکن یہ "تسلیم کرنا" صرف زبانی ہے۔ عملاً اب تک کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکا ہے۔

۳۔ موجودہ ترقیات اور بدلے ہوئے حالات سے سب مرعوب و متاثر ہیں لیکن مرعوبیت اور تاثر کا ردِ عمل دو مختلف طریقوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔

ایک طبقہ حدود و قیود کو نظر انداز کر کے سب کچھ قبول کرنے میں خوش ہے۔ اور دوسرا ماتم کرنے اور گریز و فرار کی راہ اختیار کرنے میں مگن ہے۔ مضطرب و غیر مطمئن نہ یہ طبقہ ہے اور نہ وہ ہے۔ پھر عدل و اعتدال کی ضرورت کس کو پیش آئے؟ اور اس کی راہیں کیونکر کھلیں؟

۴۔ عدل و اعتدال کی توقع متوسط طبقہ سے ہو سکتی تھی لیکن اس سلسلہ میں متوسط طبقہ کا عملاً وجود نہیں ہے۔ بعض حضرات کی خواہشیں یقیناً قابل قدر ہیں۔ لیکن صرف خواہشیں ہیں جو معمولی آزمائش کے وقت نہایت نیک نامی کے ساتھ دب سکتی ہیں۔ اور پھر چند دلوں کے لئے ابھر سکتی ہیں۔ ان خواہشات کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی موثر طاقت ہے اور نہ بے چین کر دینے والا احساس۔

۵۔ یہ کام جرأت و ہمت اور کھلے دماغ کے ساتھ براہ راست غور و فکر کے بغیر نہیں انجام پا سکتا ہے لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑ بندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہیں کہ ان سے صرف نظر کر کے جرأت و ہمت کے مظاہرہ کی توقع بے سود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلہ کی امید بیکار ہے۔

ان حالات میں رہنمائی کی تفصیلات پر گفتگو محض مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ ہی ہو سکتی ہے یا اس امید پر کہ مستقبل میں طوفان کی شدت قلب و دماغ کی لہروں میں ارتعاش پیدا کر دے اور پھر حفاظت کے لئے سفینہ کی تیاری پر مجبور ہونا پڑے۔

ذیل میں ترتیب وار قرآن و سنت، صحابہؓ کی زندگی اور فقہاء کے کارناموں سے رہنمائی کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

قرآن حکیم کے طریق نزول سے استدلال

(۱) قرآنی احکام دفعتہً نہیں نازل ہوئے ہیں بلکہ ۲۳ سال کی مدت میں بتدریج ان کا نزول ہوا ہے جس سے ایک طرف احکام شرعیہ میں حالات کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے اور دوسری طرف اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ شریعت سازی کی اصل بنیاد معاشرہ ہے۔

(۲) احکام کے نزول میں ضرورت، مصلحت اور مناسبت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ جیسی ضرورتیں پیش آتی رہیں اور جس قسم کے مصالح کی رعایت ناگزیر ہوتی اس کی مناسبت سے احکام کا نزول ہوتا رہا ہے جس سے مذہب اور زندگی میں باہمی ربط کا ثبوت ملتا ہے نیز یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاشرتی احوال و مصالح عمارت تعمیر کرنے کے سامان ہیں۔

طریق نفاذ سے استدلال

(۳) احکام کے نفاذ میں حالات و زمانہ کی رعایت ضروری قرار دی گئی اور اصول نسخ کے ذریعہ موقعہ و محل کے تعین کی اجازت دی گئی جو اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ جب احوال و مصالح باقی نہ رہیں گے

تو ان سے بنی ہوئی عمارت بھی ختم ہو جائے گی۔

جیسا کہ علامہ آمدی نے نسخ شرعی کی بحث میں کہا ہے،

جب زمانہ کے اختلاف سے مصالح کے اختلاف کا جواز معلوم ہو گیا تو یہ بات ممتنع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی مصلحت سمجھ کر کسی زمانہ میں کسی فعل کا حکم دے اور جب مصلحت بدل جائے تو اس سے منع کر دے جس طرح طبیب کسی زمانہ میں کسی دوا کا حکم دیتا ہے اور پھر جب اختلاف مزاج کے وقت مصلحت بدل جاتی ہے تو اس دوا کے استعمال سے روک دیتا ہے۔

پھر کچھ تفصیل کے بعد ہے،

اگر زمانہ کے اختلاف سے مصالح کے اختلاف کا معاملہ نہ ہوتا تو احکام میں اختلاف کی صورتیں نہ پیدا ہوتیں اور جب زمانہ کے اختلاف سے مصالح کے اختلاف کا جواز موجود ہے تو نسخ کے ممتنع ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں [1]

قاضی بیضاوی کہتے ہیں،

جواز نسخ اس لئے کہ اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے بندوں کے نفوس کی تکمیل اور ان کے مصالح کے حصول کے لئے آیتیں نازل کیں اور احکام مقرر کئے ہیں اور مذکورہ امور زمانے اور اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ بالخصوص معاش کے اسباب و ذرائع جو ایک زمانہ میں نافع ہوتے ہیں وہ دوسرے میں مضر ہو جاتے ہیں۔ [2]

نسخ شرعی کی توجیہہ | جمہور مفسرین نے نسخ کی توجیہہ میں نہایت نفیس اور دور رس بات کہی ہے چنانچہ تفسیر المنار میں ہے،

جمہور مفسرین نے نسخ کی توجیہہ میں کہا ہے کہ فی نفسہٖ نسخ آیت کے کوئی معنی نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ احکام زمان و مکان اور حالات کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔ جب کوئی حکم ایک وقت میں شدید حاجت کی بنا پر ہے اور وہ حاجت دوسرے وقت میں باقی نہ رہی تو حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حکم منسوخ ہو جائے۔ اور اس کی جگہ دوسرا حکم دوسرے وقت کے مناسب آ جائے۔ یہ دوسرا حکم فائدہ کے لحاظ

---

[1] احکام الاحکام ج ۳ (ص ۱۶۶)۔ [2] بیضاوی (ص ۹۸)

سے پہلے بہتر یا اس جیسا ہو گا۔ کیونکہ اب اسی کے ذریعہ مصلحت کا قیام ہو گا۔ [1]

موقع ومحل کی تعیین کا لفظ زیادہ موزوں ہے

اس قاعدہ کے لحاظ سے آخری شریعت کے جن احکام میں حالات وزمانہ کی رعایت ناگزیر ہو گی ان پر حقیقی نسخ کا اطلاق درست نہ ہو گا کیونکہ روح اور مقصد کے ساتھ اصل حکم ہمیشہ برقرار رہے گا۔ اس میں تبدیلی کبھی نہ ہو گی۔

تبدیلی صرف شکل وصورت میں ہوتی رہے گی جس کے لئے نسخ کے بجائے ہماری زبان میں موقع ومحل کی تعیین کا لفظ زیادہ موزوں ہے اور اس کے لئے احکام منصوصہ وغیر منصوصہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے جیسا کہ فقہ میں ہے:-

ہر حکم شرعی "نسخ" کو قبول کرنے والا ہے، معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے۔ [2]

موقع ومحل کی تعیین ہی سے مذہب و زندگی کا رشتہ باقی رہتا ہے

انفرادی و اجتماعی زندگی کے حالات مختلف ہوتے ہیں، ان کے لحاظ سے احکام شرعیہ کے موقع ومحل کے تعیین کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ اگر اس ضرورت کو ملحوظ رکھ کر تعیین نہ کی جاتی رہی تو اکثر حالات میں بیشتر احکام ناممکن العمل قرار پائیں گے یا ان کا کوئی محل نہ باقی رہے گا۔ اور بالآخر مذہب وزندگی کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ جیسا کہ فقہ کی اس عبارت سے وضاحت ہوتی ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ ایک شے سے اس حالت میں روک دیا جاتا ہے۔ جبکہ کوئی مصلحت نہ ہو۔ لیکن جب مصلحت ہو تو وہ شی جائز ہو جاتی ہے، مثلاً درم درم کے عوض مدت متعینہ تک خرید وفروخت میں ناجائز ہے، اور قرض میں جائز ہے۔ اسی طرح تازہ کھجور کو خشک کھجور کے عوض بیچنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں دھوکا اور سود دونوں پائے جاتے ہیں لیکن جب اس میں راجح مصلحت پائی جائے تو جائز ہے جیسا کہ عرایا کے پھلوں میں ہوتا ہے۔ تاکہ خلق خدا کے لئے وسعت ہو۔ [3]

عرایا کی صورت یہ تھی:

ایک شخص پھل کھانے کے لئے کسی کو عاریۃً کھجور کا درخت دیتا تھا پھر انتفاع کی شکلوں میں دشواری کی وجہ سے درخت کو واپس لے لیتا اور اس کے عوض اندازہ کر کے خشک کھجور دے دیتا تھا [4]

محمد بن لبید کہتے ہیں کہ میں نے زید سے پوچھا "یہ عرایا کیا ہیں"؟ تو زید نے انصار کے چند ضرورت مند لوگ

---

[1] المنار ح (ص ۱۴۴) [2] المستصفیٰ (ص ۱۲۳) [3] الموافقات وحاشیہ ج ۲ (ص ۳۰۵) [4] حاشیہ ہدایہ (ص ۳۰)

کا نام لیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ موسم میں تازہ پھل آتا ہے اور نقدی نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ محروم رہتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس جو خشک کھجوریں موجود رہتی ہیں ان کے عوض "عرایا" خرید لیا کرو اس طرح تازہ پھلوں سے محرومی نہ رہے گی [1]

ایک واقعہ سے تعیین کی اہمیت کا اندازہ

احکام شرعیہ میں موقع و محل کی تعیین کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ہوتا ہے:

ایک مرتبہ صاحبزادہ عبدالملک نے احکام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا،
آپ کو کیا ہو گیا کہ آپ احکام نافذ نہیں کرتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر حق کے معاملہ میں ہانڈیوں کو اُبال آجائے جب بھی میں اس کی پرواہ نہیں کرتا ہوں۔ [2]

جواب میں حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے فرمایا:
بیٹے جلدی نہ کرو، اللہ نے قرآن حکیم میں دو مرتبہ شراب کی برائی بیان کی اور تیسری مرتبہ اس کو حرام کیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر "حق" لوگوں پر دفعتہً مسلط کر دوں تو وہ اس کو دفعتہً اتار پھینکیں گے اور اس سے مستقل فتنہ ہو گا۔ [3]

احکام کے اندازِ بیان سے استدلال

قرآن حکیم نے احکام کے بیان کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے بھی حالات و زمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے۔

مثلاً بعض احکام میں صرف مقاصد بیان کئے گئے ہیں، اور ان کی شکل و صورت نہیں متعین کی گئی ہے اور بعض میں صرف حدود اربعہ ذکر کئے گئے ہیں، اور شکل و صورت سے بحث نہیں ہے، اسی طرح بہت سے احکام میں اصولی اور عمومی انداز کی گفتگو ہے اور جزئیات کی تشریح نہیں ہے۔ اور بعض جگہ جزئیات کی تشریح کے باوجود موقع و محل کی تعیین کی اجازت دی گئی ہے، فقہاء نے اسی صورت حال کو دیکھ کر کہا ہے:

اللہ نے بعض وہ احکام نازل فرمائے ہیں جن میں ہر زمان و مکان کی صلاحیت موجود ہے قواعد عامہ نازل کئے جن کے ذریعہ لوگوں کے، ان کے احوال اور مواقع کی مطابقت ممکن ہے۔ [4]

ایک اور موقع پر ہے۔

یہ بات ضروری ہے کہ ایسی نئی نئی صورتیں پیش آئیں جن کا حکم صراحتہً موجود ہو اور نہ پہلے

---

[1] المنتقی ج ۲ (ص ۷۰) [2] الموافقات ج ۲ (ص ۹۴) [3] الموافقات ج ۲ (ص ۹۴) [4] الفقہ علی المذاہب الاربعہ مقدمہ ثانیہ (ص ۱۶)

لوگوں نے اجتہاد کیا ہو۔ ایسی حالت میں اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ من مانی کاروائی کریں یا اجتہاد شرعی کے بجائے محض اٹکل کے تیر چلائیں تو یہ سب فساد اور ہلاکت ہے۔ [۱]

تکمیل ہدایت وجامعیت کا مطلب اس صورت حال سے نہ تکمیل ہدایت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ قرآن حکیم کی جامعیت پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جامعیت اور تکمیل کی یہی صورت ممکن ہو سکتی ہے نہ وہ جس کی نمائندگی عام طور پر ہو رہی ہے۔ اور نتیجۃً الٰہی شریعت ایک خاص دور اور زمانہ میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

قرآن اپنے اختصار کے باوجود جامع ہے اور جامع اسی صورت میں ہے کہ اس میں امور کلیہ کا بیان ہے۔ کیونکہ شریعت اس کے نزول کے اختتام کے ساتھ مکمل ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے الیوم اکملت لکم دینکم [۲]

دوسری جگہ ہے:

عقائد کے قواعد اور شرائع کے اصول بیان ہوئے ہیں اور اجتہاد کے قوانین کی نشاندہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہر جزوی واقعہ و حادثہ کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے۔ [۳]

مالیاتی تنظیم وتقسیم کی کوئی شکل متعین نہیں ہے قرآن حکیم کے انداز بیان سے احکام میں حالات وزمانہ کی رعایت کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) **مالیات کی تنظیم وتقسیم:**

قرآن حکیم نے اس کی کوئی خاص شکل وصورت متعین نہیں کی ہے صرف مقصد پر زور دیا ہے کہ اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عدل واحسان کے ساتھ اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں۔

انفرادی واجتماعی ملکیت کی بحث چونکہ طریق کار سے متعلق تھی جس میں حالات وزمانہ کی رعایت ناگزیر ہے اس بنیاد پر اس بحث کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ امانت ونیابت کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے اس بحث کو ختم کر دیا ہے کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان کو ساری چیزیں نائب ہونے کی حیثیت سے بطور امانت استعمال کے لئے دی گئی ہیں۔

عمومی انداز کی چند آیتیں اس سلسلہ کی چند آیتیں عمومی انداز کی یہ ہیں:

---

[۱] الموافقات ج ۴ (ص ۱۰۴) [۲] الیضاح ج ۴ (ص ۲۴۷) [۳] توضیح (ص ۰۵)

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا [1]

بیشک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اس کے اہل تک پہونچا دو۔

آیت میں "امانات" سے تمام حقوقِ واجبہ اور ہمہ قسم کی ذمہ داریاں مراد ہیں۔

ان الامانات جمع امانة يعمّ الحقوق المتعلقة بذمتهم من حقوق الله تعالىٰ وحقوق العباد۔ [2]

امانات امانت کی جمع ہے جو تمام حقوقِ واجبہ کو عام ہے۔ خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہوں

دوسری جگہ ہے:

(۲) وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ [3]

اور اس سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے۔

تنظیم و تقسیم کے بعض احکام کا ذکر کرنے کے بعد ہے:

(۳) كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ [4]

تاکہ دولت تم میں مالداروں کے درمیان سمٹ کر نہ رہ جائے۔

خرچ کے بارے میں ایک موقعہ پر سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے:

قُلِ الْعَفْوَ [5]

آپ کہہ دیجئے جو ضرورت سے فاضل ہو سب خرچ کر دو

دوسرے موقعہ پر یہ جواب مذکور ہے۔

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ - [6]

آپ کہہ دیجئے جو بھی تم اپنے مال سے نکال سکتے ہو نکالو تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ، عزیز و اقربا یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔

جواب کا اختلاف معاشرتی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کے حدود میں فرق کو ظاہر کرتا ہے اور "العفو" سے تو اس حد تک ثبوت ملتا ہے کہ حالات کے دباؤ کے وقت ضرورت سے فاضل اموال میں کوئی حق نہیں ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ بہت سے مقامات پر خرچ کرنے کی تاکید ہے۔ اور مستحقین کی تفصیل ہے لیکن مقدار اور تقسیم کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے احکام حالات و زمانہ کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں۔

---

[1] اسلام کا زرعی نظام (ص ۲۹۲)

خاص شکل کے تعین سے ہر دور کی ضرورتیں نہیں پوری ہو سکتی ہیں

جس طرح معاشرتی زندگی کے حالات ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے ہیں اسی طرح عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین میں بھی یکسانیت نہیں ملحوظ رہ سکتی۔

جب قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو اور دوسرا طبقہ وسائل معاش سے محروم ہو کر نانِ جویں کا محتاج ہو تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اس وقت سے یقیناً مختلف ہوں گے جب کہ قوم خوشحال ہو اور معاشرتی عدم توازن محرومی کی حد تک نہ پہنچا ہو ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کے کسی ایک طریقہ کی نشاندہی کر دیتا یا مروجہ انفرادی و اجتماعی ملکیت کی بحث کو اصولی اور بنیادی قرار دیتا تو اس کی عالم گیریت پر کس قدر زد پڑتی۔ اور تکمیل ہدایت کی بات کس حد تک تشنہ رہ جاتی؟

مقصود عدل کا قیام ہے، طریق کار سے بحث نہیں

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں۔

شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعہ عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا۔[1]

ایک اور جگہ علامہ نے اس حقیقت کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے:

شریعت کا مدار حکمتوں اور دینوی و اخروی زندگی کی مصلحتوں پر ہے۔ وہ مجسمہ عدل و رحمت ہے اور کل حکمت و مصلحت ہے۔ جو مسئلہ بھی عدل سے جور کی طرف، رحمت سے زحمت کی طرف، مصلحت سے مفسدہ کی طرف اور حکمت سے بے موقع بات کی طرف خروج کرے گا وہ شریعت کا مسئلہ نہ ہوگا اگرچہ تاویل کے ذریعہ شریعت میں داخل کر لیا جائے۔[2]

یہ عبارت باب تغیر الفتویٰ کی ہے جس میں علامہ نے بہت سی مثالوں کے ذریعہ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت ثابت کی ہے اور کہا ہے:

یہ فصل نہایت نفع دینے والی ہے اس سے جہالت کی وجہ سے شریعت کے بارے میں بڑا مغالطہ ہو گیا ہے اور لوگ طرح طرح کی تنگی و مشقت میں مبتلا ہو گئے ہیں جن سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔[3]

معاشرتی حالات کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں تفاوت

معاشرتی حالات کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں جو تفاوت ہوتا ہے اس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے۔

فقہاء نے دینوی مصالح کی تین قسمیں کی ہیں یا تین درجے بیان کئے ہیں۔

---

[1] الطرق الحکمیہ (ص ۱۴) [2] اعلام الموقعین ج ۳ (ص ۲۷) [3] اعلام ج ۳ (ص ۲۷)

(۱) ضروریات (۲) حاجات اور (۳) تکملات (ادنیٰ، اعلیٰ اور متوسط)

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کھانے پینے، لباس، مکان، نکاح، سواری وغیرہ کی اس قدر سہولت حاصل ہو کہ بس ان کے ذریعہ کام چلتا رہے۔

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمدہ غذا، بہترین لباس، عالیشان مکان، اچھی قسم کی سواریاں اور خوبصورت عورتوں سے شادی وغیرہ کا سروسامان ہو۔

اوسط درجہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ یعنی نہ اس قدر وسعت ہو کہ تکملات کے درجہ کو پہونچ جائے اور نہ اس قدر تنگی ہو کہ ضروریات کے درجہ میں رہ جائے [۱]

فقہا اوسط درجہ کی مصالح کو حاجات سے تعبیر کرتے ہیں اور احکام میں رعایت کی بات صرف اس پر نہیں ختم ہوتی ہے کہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں بلکہ یہاں تک پہونچتی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق طلب مصلحت کی راہیں کھلیں اور اوسط درجہ میں لوگوں کی حاجتیں رفع ہوں چنانچہ

اس مقدار میں لوگوں کو پہونچنا کہ اس کے ذریعہ ان کی حاجتیں پوری ہوں یہ عدل ہے۔

اگرچہ مقدار میں فرق ہو۔ مساوات حاجت کے دفعیہ میں ہے نہ کہ مقدار میں کیونکہ نفقات وغیرہ میں شریعت کا مقصود اعظم لوگوں کی حاجتیں پوری کرنا ہی ہے۔ [۲]

طریق کار میں کافی وسعت اور گنجائش ہے | اس مقصود اعظم کو حاصل کرنے اور عدل تک پہونچنے کے لئے جس قسم کی تنظیم و تقسیم درکار ہوگی اور جیسے قوانین وضع کرنے ہوں گے وہ سب شرعی اور اسلامی ہوں گے۔

طریق کار کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو یا اس کے مطابق وحی نازل ہوئی ہو کیونکہ اس میں حالات و زمانہ کی رعایت سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

جب حق کی علامتیں اور دلیلیں ظاہر ہوں تو جس طریقہ سے بھی ہوں وہ شرع اور دین ہوگا اور اسی میں اللہ کی رضا اور اس کا حکم ہوگا۔ [۳]

معاشرہ کو اگر مذکورہ مقام تک پہونچانے کے لئے انفرادی حقوق کی پامالی ہوگی تو شریعت میں اس کی پوری گنجائش ہے اور حقوق ملکیت کے ہر گورکھ دھندے کو توڑنے کی اجازت ہے۔

کیونکہ شریعت میں مصالح خاصہ کے مقابلہ میں مصالح عامہ کا بہت زیادہ لحاظ کیا ہے۔ [۴]

اجتماعی نظم و قوانین کی بھی پوری اجازت ہے | ظاہر ہے کہ معاشرتی عدم توازن جب محرومی کی حد تک نہ ہوگا تو مذکورہ درجہ کیلئے بنیادی تبدیلی کرنی پڑیگی۔ اور نہ مقابلۃً زیادہ سخت قوانین بنانے کی ضرورت ہوگی لیکن اگر معاشرہ کا یہ حال ہے کہ ایک

---

[۱] قواعد الاحکام فی مصالح الانام ج ۲ (ص ۶۰)، [۲] قواعد الاحکام ج ۱ (ص ۶۸)، [۳] اعلام ج ۳ (ص ۳۰۵)

[۴] قواعد الاحکام ص ۳۸

طبقہ وسائل سے محروم ہو کر نان جوین کا محتاج ہو اور دوسرا ہر قسم کے عیش و عشرت میں مشغول ہو تو اس وقت عدل و توازن پیدا کرنے کیلئے نہ صرف سخت قوانین درکار ہوں گے بلکہ تنظیم و تقسیم کے نظام میں بنیادی تبدیلی بھی ناگزیر ہو گی حتیٰ کہ اگر اجتماعی نظم و قوانین سے مقصود حاصل ہونیکی توقع ہو گی تو اس سے گریز جرم قرار پائیگا۔ اور لوگوں کی حق تلفی کا باعث بنے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر فرمایا :

انسان کا تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں کوئی حق نہیں ہے (۱) رہنے کیلئے گھر (۲) تن ڈھکنے کے لئے کپڑا اور (۳) پانی اور روٹی کا ٹکڑا۔ [1]

اسی طرح ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا :

جسکے پاس زائد سواری ہو وہ اس کو دیدے جسکے پاس سواری نہیں ہے اور جسکے پاس زائد زادراہ ہو وہ اس کو دیدے جس کے پاس نہیں ہے راوی (ابو سعید خدری) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت مختلف قسم کے اموال کا ذکر کیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے سمجھا کہ زائد مال میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ [2]

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

جس بات کا آج اندازہ ہوا ہے اگر پہلے سے ہوتا تو مالداروں سے فاضل اموال لیکر فقراء مہاجرین میں تقسیم کر دیتا۔ [3]

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

اللہ تعالیٰ نے مالداروں پر فقراء کی کفالت فرض کر دی ہے۔ اگر وہ بھوکے ننگے رہے یا اور کسی معاشی پریشانی میں مبتلا ہوئے تو اس بنا پر کہ مالداروں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے حساب لیگا اور ان کو عذاب دیگا۔ [4]

غرض حکومت و خلافت کو معاشرتی زندگی میں عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کیلئے ہر طریق کار اختیار کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے کی اجازت ہے خواہ اسکی مثال پہلے موجود ہو یا نہ ہو۔

مذہب کے بقاء کے لئے معاشی حالت کی اہمیت

مذہب کی ترویج و تبلیغ میں جب تک دنیوی مصالح کو خاص اہمیت نہ دی جائے گی اس وقت تک نہ مذہب کی حفاظت و بقا کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ اقامت دین کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

یاد رکھو کہ آخرت کے مصالح اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے ہیں جب تک دنیا کے اہم مصالح کا لحاظ نہ کیا جائے جیسے کھانا، پینا، شادی۔ بیاہ۔ اور دیگر بہت سے منافع کا حصول۔ [5]

دوسری جگہ ہے :

اموال میں اللہ تعالیٰ کا حق بندوں کے حقوق کے تابع ہے [6] (باقی)

---

[1] ترمذی [2] علی ابن حزم ج ۶ ص ۱۵۶ و ۱۵۷) [3] حوالہ بالا [4] حوالہ بالا (ص ۱۵۶) [5] قواعد الاحکام صفحہ [6]

محمد نیاز

مسئلہ حفاظتِ فروج اور نیاز فتحپوری

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى
اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ـ (۲۳ / ۵)

۱ - اس آیت میں شرمگاہوں کی حفاظت سے میاں بیوی اور لونڈی غلاموں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

۲ - اس لئے اگر "حفاظت فروج" سے مستثنیٰ کرنے کے معنیٰ یہ لئے جائیں کہ جس طرح میاں بیوی کا اختلاط جائز ہے، اسی طرح "مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" کے ساتھ بھی یہ تعلقات قائم کرنا ناجائز نہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اگر کسی گھر کے مرد لونڈیوں سے ملتفت ہو سکتے ہیں تو اس گھر کی عورتیں بھی غلاموں سے اختلاط پیدا کر سکتی ہیں۔

۳ - کیونکہ "مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" میں لونڈی اور غلام دونوں شامل ہیں۔

۴ - لیکن یہ معنیٰ کسی نے نہیں لئے اور صرف لونڈیوں کو اپنے اوپر حلال کر لیا۔

۵ - اگر کہا جائے کہ "مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" سے مراد صرف لونڈیاں ہیں، تو ایسا کہنے اور سمجھنے کی کوئی وجہ ہونا چاہیئے اور وہ وجہ موجود نہیں۔

۶ - اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں "تحفظ فروج" کا تعلق جنسی تعلق سے ہے ہی نہیں بلکہ صرف خانگی زندگی کی ان آزادیوں یا بے پروائیوں سے ہے جو بسا اوقات شرمگاہوں کے ظاہر ہو جانے کا سبب ہو جاتی ہیں۔ اور قرآن میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ اگر

احیاناً میاں بیوی یا گھر کے لونڈی غلاموں کے سامنے، جو ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں، جسم کا وہ حصہ جو چھپانے کے قابل ہے۔ احیاناً عریاں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔
۷۔ اگر ان سے مراد جنسی تعلق ہو تو وہ بھی مشروط ہوگا نکاح سے جس کا حکم سورۂ نور میں دیا جا چکا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس "نگار پاکستان" کی اشاعت ماہ اکتوبر ۶۴ء سے نقل کیا گیا۔ خیالات جناب نیاز فتحپوری کے ہیں۔ انہوں نے "اسلام اور کنیزیں" کے زیر عنوان، جناب سید انیس شاہ جیلانی محمد آباد (رحیم یار خاں) کے ایک استفسار پر اظہار خیال فرماتے ہوئے، مندرجہ بالا آیت قرآنی نقل کر کے، ان خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں نے آیت سے متعلق ان کی مکمل تحریر نقل کی ہے۔ البتہ انکے فقروں کو نمبروں میں تقسیم کرنے کا گنہگار میں ہوں اور نمبر ۲ میں ایک عدد بریکٹ بنا کر اسمیں ایک لفظ "کرنا" کا اضافہ میں نے کیا ہے ــــ جو میرے خیال میں سہو کتابت کے سبب چھوٹ گیا ہوگا۔

ظاہر ہے مجھے جناب نیاز کے مندرجہ بالا خیالات سے اتفاق نہیں ہے اور اقتباس نقل کرنے کا مقصد اسی پر تبصرہ کرنا ہے۔

مذکورہ آیت سورۃ المعارج کی ہے اور مع اپنے سیاق و سباق کے سورۃ المعارج میں اس طرح واقع ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ۔

(۷۰/۱۹-۳۵)

آیات کے اس پورے سلسلے کو بغور ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کی ابتدا کی ہے اس تذکرے سے کہ انسان خلقی طور پر بڑے ہی کچے جی کا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"بے شک آدمی بنا ہے کچے جی کا۔ جب لگی اس کو برائی
تو گھبڑا۔ اور جب لگی اس کو بھلائی تو اَن دیوا۔"

لیکن اس مختصر سے تذکرے کے بعد اللہ تعالےٰ نے فوراً وہ صفات گنانا شروع کر دی ہیں، جن کے ذریعہ آدمی اپنی اس خلقی کمزوری پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے کچھ خاص صفات کے لوگوں کو اس کمزوری سے مستثنیٰ قرار دے کر بتایا ہے کہ فلاں فلاں اعمال پر کاربند ہونے والے لوگ اس ذیل میں نہیں آتے۔ اس طرح اس نے ایک اعلیٰ کیریکٹر رکھنے والے مومن کا نہایت ہی دلکش اور واضح نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ از راہ اغلباً شاہ صاحب مرحوم کا ترجمہ حاضر ہے۔

"مگر وہ نمازی جو اپنی نماز پر قائم ہیں۔ اور جن کے مال میں حصہ ٹھیرا ہے، مانگتے اور بے مانگے کا۔ اور جو یقین کرتے ہیں انصاف کے دن کو۔ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک ان کے رب کے عذاب سے نڈر نہ ہوا جائے۔ اور جو اپنی شہوت کی جگہ تھامتے ہیں، مگر اپنی جوروں سے یا اپنے ہاتھ کے مال سے، سو ان پر نہیں الاہنا پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوائے سو وہی ہیں حد سے بڑھتے۔ اور جو لوگ اپنی دھر دھریں اور اپنا قول نباہتے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیوں پر سیدھے ہیں۔ اور جو اپنی نماز سے خبردار ہیں۔ وہی ہیں باغوں میں عزت سے۔"

آیات کا متن اور ان کا پورا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ پوری عبارت میں ان لوگوں کے لئے خوشخبری ہے، جو مذکورہ صفات کے حامل نہیں مگر حامل بننے کا حوصلہ و ارادہ رکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے مذمت ہے جو مذکورہ صفات کے حامل ہیں مگر ان کا حوصلہ کر سکیں۔ نیز ان صفات کے حامل انسانوں کے لئے "اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ" کہہ کر ان سے عاری انسانوں کی طرف سلباً ایک اشارہ ہے کہ وہ مذکورہ صفات سے عاری ہیں تو موعودہ "جنات" سے بھی محروم ہیں۔

ہدایات جو ان آیات سے نکلتی ہیں ہر شخص انہیں گن لے سکتا ہے پھر ایک ایک ہدایت کے ذریعہ جو احکام دور دور تک کے لئے مستنبط ہوتے ہیں ان کا بھی ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سر دست مجھے موضوع کے مطابق اس ہدایات کا جائزہ لینا ہے۔ جو "حفاظت فروج" سے متعلق آیت میں موجود ہے۔

چنانچہ نہ صرف "حفاظتِ فروج" سے متعلق آیت زیر بحث میں، بلکہ اس پورے اقتباس میں

جو میں نے سورۃ المعارج سے نقل کیا ــــ بلکہ اگر آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو پوری سورۃ المعارج میں ہی ــــ ایک اہم نکتہ واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر جگہ مخاطبت صرف مردوں سے ہے۔ نہ کسی عورت سے ہے، نہ غلام سے، نہ کنیز سے، اب یہ مرد لوگ مذکورہ ہدایات کے مخاطب خواہ براہ راست ہوں، خواہ گھما پھرا کر ــ چنانچہ میرے اس دعوے پر وہ تمام ضمیریں، صلے اور صیغے وغیرہ گواہ ہیں، جو آیات میں موجود ہیں۔

الذین - ھُم - ھِم - ھُ - حٰفظون - یحافظون - دائمون - قائمون - ملومین وغیرہ وغیرہ کوئی صیغہ، کوئی ضمیر، کوئی صلہ مؤنث ہی نہیں۔ سب کے سب مذکر ہیں۔ ان آیات میں ھُم اور ھِم کی تو بھر مار ہے جو پکار پکار کر بتا رہی ہیں کہ آیات کے مخاطبین ذکور ہیں ــــ خواہ وہ ہدایات جو ان آیات سے مستنبط و منجلی ہوں، عورتوں کے لئے بھی قرآن نے دیئے ہوں۔ لیکن آیات زیر بحث میں مخاطب مرد ہی ہیں۔ اگر عورتوں کے لئے بھی بعینہٖ یہی ہدایات و احکام اسلام نے دیئے ہوں تو استدلال کے لئے ان کی تلاش قرآن کے دوسرے مقامات پر کیجئے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ان آیات کا مخاطب زبردستی غلاموں اور عورتوں کو بھی قرار دیا جائے؟

بس اسی ایک نکتہ کو نظر انداز کر کے جب محترم نیاز صاحب مدیر نگار لکھنے لگے تو سب سے پہلی غلط بات انہوں نے یہ لکھدی کہ

> اس آیت میں شرمگاہوں کی حفاظت سے میاں بیوی
> اور لونڈی غلاموں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے"

انہوں نے " ازواج " کے معنی متعین کئے " میاں اور بیوی " نیز " ما ملکت ایمانھم " کے معنی لئے " لونڈی اور غلام " اور آیت میں جو ہدایت ہے اس کا مخاطب بنایا مرد کو بھی عورت کو بھی۔ بلاشبہ آیت کے سیاق و سباق سے الگ کر کے صرف باعتبار لغت دیکھئے تو " زوج " کے معنی ہیں " جوڑا " ــــ جوڑا مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد۔ اسی طرح " ملک یمین " سے مراد ہے " زرخریدلے " خواہ ذکور سے ہو خواہ اناث سے۔ لیکن آیت میں لفظ " ازواج " اور " ما ملکت ایمانھم " کے معنی یہاں اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ذکور و اناث ہر دو پر مشتمل ہو نہیں سکتے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ہدایت کے مخاطب صرف مرد ہیں۔ لہٰذا " ازواج " سے مراد " بیویاں " اور " ما ملکت ایمانھم " سے مفہوم " کنیزیں " ہی ہیں۔ ہاں اگر مخاطبین مرد و عورت دونوں یکساں طور پر ہوتے تو نیاز صاحب کا خیال بجا ہوتا۔ لیکن مخاطب چونکہ صرف مرد ہیں۔ لہٰذا ان کا خیال درست نہیں۔

لہ مملوک (طلوع اسلام)

نیازؔ صاحب مدیر نگار کی قوت متخیلہ کی تیز پردازیوں سے کون آگاہ نہیں؟ خیال کی ایک غلطی سے دوسری غلطی نے جنم لیا۔ وہ اُن وادیوں میں نکل گئے جہاں ان کی چشم تصور نے مالکوں کو کنیزوں سے ہم بستر ہوتے دیکھا تو مالکاؤں کو غلاموں سے بغلگیر ہوتے پایا (ان کے مسلسل فقروں میں سے اس ٹکڑے کو ملاحظہ فرمائیں جس پر میں نے ۲ کا نمبر لگا دیا ہے) پھر انہوں نے دیکھا کہ یہ چھوٹ تو کسی مفسر قرآن نے نہیں دی۔ تب علماء و مفسرین سے ان کی دیرینہ روایتی بدگمانی سامنے آئی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا:-

"لیکن یہ معنی کسی نے نہیں لئے اور صرف لونڈیوں
کو اپنے اوپر حلال کر لیا"

ہیں بھی علماء و مفسرین سے کچھ ضرورت سے زیادہ خوش گمان نہیں ہوں۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ بے سوچے سمجھے ان بزرگوں کو نشانہ بنانے کو روا سمجھوں۔ نیازؔ صاحب کے ان الفاظ کے مطابق شروع سے لے کر اب تک گویا سارے علماء مفسرین اور ائمہ خائن تھے کہ آیت تو مسلمان خواتین کو بھی ایک "رنگین سا" حق دے رہی تھی۔ لیکن انہوں نے ازراہ خیانت یہ حق سلب کر لیا۔ البتہ وہ حق، جو خود انہیں حاصل ہو رہا تھا، ان سے چھوڑا نہ گیا۔ اس طرح دنیا کا کوئی عالم، کوئی مفسر، کوئی امام اس "معاملۂ خاص" میں عورتوں سے انصاف نہ کر سکا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

لیکن ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ جناب نیازؔ نے آخر کار اس بیسویں صدی میں، اور اپنی عمر کے آخری حصے میں جبکہ وہ اپنی موت کی پیشینگوئی تک کرنے لگے ہیں، مسلم خواتین کو ان کا صدیوں کا "غصب شدہ" حق واپس دلوا دیا ہے۔ انہوں نے اس وجہ کو تو نظر انداز کیا جس کے تحت آیت میں "ما ملکت ایمانھم" سے مراد صرف "لونڈیاں" ہیں۔ اور ظاہر یہ کیا کہ "صرف لونڈیاں کہنے اور سمجھنے کی کوئی وجہ ہونا چاہیئے اور وہ وجہ موجود نہیں ہے" لیکن دوسری طرف خواتین کو وہ "چھوٹ" دینے پر ان کا ضمیر بھی راضی نہ ہوا جس کا ذکر انہوں نے خود ہی کیا تھا۔ اور جو انتہائی فحش ہے۔ تب انہوں نے "تحفظ فروج" ہی کی ایک نئی تاویل کر ڈالی۔

"اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں "تحفظ فروج" کا تعلق جنسی تعلق سے ہی نہیں۔ بلکہ صرف خانگی زندگی کی ان آزادیوں یا بے پروائیوں سے ہے جو بسا اوقات شرمگاہوں کے ظاہر ہونے کا سبب ہو جاتی ہیں۔ اور قرآن میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ اگر احیاناً میاں بیوی

یا گھر کے لونڈی غلاموں کے سامنے جو ہر وقت آتے جاتے رہتے
ہیں، جسم کا وہ حصہ جو چھپانے کے قابل ہے، اجیاناً عریاں ہو جائے
تو مضائقہ نہیں "

ناظرین نے محسوس کیا ہوگا کہ "مقید" کو "مطلق" بنانے کی مثال آگے گزر چکی ہے۔ یعنی جہاں "ازواج" سے مراد "صرف بیویاں" اور "ما ملکت ایمانھم" سے مراد صرف "لونڈیاں" ہے۔ وہاں جناب نیازؔ نے اس میں وسعت پیدا کرکے "ازواج" کا مفہوم "میاں بیوی دونوں" اور "ما ملکت ایمانھم" سے مراد "لونڈی غلام دونوں" لیا۔ اب یہاں "مطلق" حکم کو "مقید" بنا کر پیش کرنے کی واضح مثال کو محسوس کریں۔ یعنی قرآن حکم دے رہا ہے مطلق "حفاظت فروج" کا اور نیازؔ صاحب اسے محدود کر رہے ہیں صرف "ستر پوشی" تک۔ قرآن نے "ثم نفروجھم تحفظون" کہہ کر ایک نہایت ہی جامع ہدایت دی ہے۔ کیونکہ "حفظ فروج" میں ستر پوشی ہی نہیں بلکہ ان تمام اعمال سے پرہیز آگیا، جن سے انسان کو، کوئی اخلاقی، روحانی، ذہنی یا جسمانی مضرت پہونچ سکتی ہے۔ پس قرآن کے ان دو الفاظ کی "جامعیت" پر جتنا غور کیجئے، حیرت اور مسرت ہی حاصل ہوگی۔ لیکن نیازؔ صاحب کی "مانعیت" پر جسقدر مغز ماریئے، کوفت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونے کا ——

مولانا مودودی سے کبھی کسی مستفسر نے سوال کیا تھا کہ اسلام میں "حلق" سے متعلق کیا ہدایت ہے؟ غلط یا صحیح! لوگ بتاتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بحالتِ مجبوری اور بمقابلۂ زنا یہ جائز فعل ہے۔ اس موقعہ پر مولانا نے اسی "حفظ فروج" والی آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ نہ صرف روحانی، اخلاقی بلکہ طبی نقطۂ نظر سے بھی یہ فعل "عدم تحفظ فروج" کی ایک زندہ مثال ہے لہذا جواز کا کیا سوال؟ الٹا ناجائز اور گناہ ہے! (روایت بالمعنیٰ) [1]

اس ایک مثال سے ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ آیت زیر بحث میں کتنی جامعیت ہے۔ لیکن جناب نیازؔ تو دراصل ایک خود ساختہ مجبوری میں گھر گئے۔ انہوں نے پہلے آیت کے مخاطبین میں مرد و عورت ہر دو کو یکساں طور پر شریک کیا۔ پھر ہدایت جو اس سے ملی اس میں بھی مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر سہیم بنانے کا سوال ان کے ذہن میں ابھرا۔ لیکن عورت کو غلام کے ساتھ چھوڑ دینے کی ہمت انہیں کہاں سے مل جاتی! قرآن کی دیگر ہدایات کے علاوہ خود بداہتہً یہ امر ناممکن تھا۔ چنانچہ ع

---

[1] ہمیں اس کا علم نہیں۔ (طلوع اسلام)

ع کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شد

انہوں نے قرآن کی اس واضح ہدایت ہی کو اپنی بے مثال جرأتِ "تاویل" کا نشانہ بنایا۔ مگر ان کی عبارت میں "لبسا اوقات" اور "احیاناً" کی تکرار بے جا، صاف چغلی کھاتی ہے کہ وہ اس تاویل کو بھی بمشکل حلق سے باہر لا سکے ہیں۔ اول تو ۱۔ اگر بالفرض آیت زیر بحث میں "حفظِ فروج" سے مراد صرف "ستر پوشی" ہی ہوتی، جب بھی "لبسا اوقات" اور "احیاناً" کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سیدھی سیدھی ہدایت نکلتی ہے کہ "مالکہ" اپنے "غلام" کے سامنے اور "مالک" اپنی "کنیز" کے آگے "ستر کھولے" تو وہ "غیر ملوم" ہے۔ پس کھلی چھٹی ہے۔ جس کے جی میں آئے "بادنیٰ ضرورت" بھی ستر کھولتا پھرے یا ستر کھولتی پھرے۔

دوم :۔ اگر "لبسا اوقات" اور "احیاناً" ہی کا سوال ہے تو پھر یہ لبسا اوقات اور احیاناً تو محض غلام و کنیز کیا، کسی بھی غیر محرم مرد کے سامنے عورت کا ستر کھل جا سکتا ہے۔ کیونکہ "لبسا اوقات" اور "احیاناً" میں قصد و ارادہ کا دخل نہیں ہوتا۔ غالباً نیاز صاحب کا مطلب بھی اسی "احیاناً" سے ہے۔ پھر اتفاقاً یہ فعل کسی سے کسی کے سامنے سرزد ہو جائے تو وہ "ملوم" کیوں کر ہو سکتا ہے؟

مگر اب تک نیاز صاحب کی عبارت کے جس حصے تک میں نے گفتگو کی ہے۔ اس حصے تک پہونچکر بھی خود نیاز صاحب پورے طور پر مطمئن نظر نہیں آتے۔ غالباً یہ عدم اطمینان ان کے دل میں اس وقت پیدا ہوا ہے، جب وہ اپنی تحریر کی کتابت شدہ کاپی ملاحظہ فرمانے لگے ہیں۔ کیونکہ یہاں تک کی عبارت کے بعد قدرے مختلف اور خفی خط میں اس سلسلے کا آخری فقرہ یوں درج ہوا ہے۔

"اگر ان سے مراد تعلق جنسی ہو تو وہ بھی
مشروط ہوگا نکاح سے جس کا حکم سورۂ
نور میں دیا جا چکا ہے"

یعنی یہ عجیب بات ہے کہ "حفاظت فروج" کے "جدید معنی" متعین کرنے کے بعد۔ پھر اس معنی کو "اصل بات یہ ہے" کہتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ "ہدیۂ ناظرین نگار" کرنے کے بعد۔

پھر وہی "معنی قدیم" کی طرف ایک عدد حرف شرط "اگر" کے ساتھ مراجعت! ؎

تڑپ رہا ہے فاطموں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف!

حالانکہ "اصل بات" وہ نہیں جسکو نیازؔ صاحب نے "اصل بات" کہہ کر پیش کیا ہے۔ بلکہ "اصل بات" یہی ہے جس کو وہ "اگر" سے مشروط کرکے پیش کر رہے ہیں۔ یعنی فی الواقع جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں آیت میں ذکر "جنسی تعلق" ہی کا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں غلام، کنیز اور ان کی جنسی زندگی سے متعلق اپنا نقطۂ نظر جو اپنی بساط کے مطابق قرآن سے مستفاد ہے پیش کر دوں۔

یہ بات معروف ہے کہ اسلام نے بڑی حکمت اور مختلف پائیدار ذرائع سے کام لے کر اسلامی معاشرہ سے غلامی کی رسم کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں بھی اس نے صاف صاف ہدایت دی۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى
اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً

اس طرح جنگی قیدیوں کی رہائی کا حکم "منصوص" ہے۔ رہائی خواہ "احساناً" ہو، خواہ "بالمعاوضہ!" پس بالجبر غلام بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— اب رہ جاتے ہیں صرف وہ قیدی جو خود اسلامی معاشرہ کا جزو بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ غلامی پر رضامند ہیں۔ کیونکہ ایک اسلامی معاشرہ میں کسی "معاشرۂ کفار" کے فرد کو مطلق آزاد کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ لیکن اس طرح کے افراد اپنے روزانہ زندگی کے فطری داعیات بھی رکھتے ہیں۔ اور ان ہی داعیات میں سے ایک داعیہ "جنس" بھی ہے۔ تو اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ان کی "تزویج" ہو۔ مگر "تعلقات جنسی بلا نکاح" کا جواز نہیں مل سکتا۔ کیونکہ اس باب میں قرآن نے واضح حکم دے دیا ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ
اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ ۔ (۲۴/۳۲)

اس آیت سے واضح ہے کہ اگر کسی غلام یا لونڈی یا اس کے مالک کو زیر بحث

نکاح کا مقدور نہ تو وہ مقدور حاصل ہونے تک صبر سے کام لے۔ لیکن اجازت اس بات کی نہیں ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بلا نکاح جنسی تعلق قائم کرلے یا کوئی اس کے ساتھ بلا نکاح جنسی تعلق قائم کرے۔

واضح رہے کہ "جنگی قیدیوں" میں مرد بھی ہوسکتے ہیں، عورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ پھر عورتوں کے سلسلہ میں اس بات کا زیادہ امکان رہتا ہے کہ وہ جہاں قید ہوکر جائیں وہیں کی سوسائٹی کا جزو بن جائیں۔ کیونکہ بہت سے مصالح و اسباب کے پیش نظر اسی میں ان کی بھلائی ہوتی ہے۔ پس اگر عورتیں قید میں آنے کے بعد اپنے وارثوں کے عدم توجہ کا شکار ہوں۔ یا احساناً بلا معاوضہ رہائی پانے پر بھی خود ہی رضامند نہ ہوں تو ان کی حیثیت اسلامی معاشرہ میں کنیز کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی۔ لیکن جب ایسی کنیزوں کی جنسی زندگی کا سوال آئے تو کھلی چھٹی ہرگز حاصل نہیں ہے کہ بلا نکاح یا بالجبر "مصرف" میں لائی جائیں۔ بلکہ سورۂ نور کی اس آیت کے پیش نظر وہ بلا نکاح جنسی تعلقات پر راضی ہوں تو بھی خود انہیں اس کی آسانی نہیں دی جاسکتی۔ نکاح شرط ہے۔

طلوع اسلام

ہم اس مضمون کی اشاعت کے بارے میں قدرے متامل تھے کیونکہ بعض مقامات پر اس کا طنزیہ انداز ہمارے نزدیک خوش آئند نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ مضمون ہندوستان سے آیا ہے اور خیالات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ہمارے وہاں کے بھائی ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں، دوسرے یہ کہ جناب نیاز (فتحپوری) اور خود صاحب مضمون "ما ملکت ایمانکم" (غلام اور لونڈیوں) کے متعلق چند ایک غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔

۲۔ غلام اور لونڈیوں کے متعلق قرآن کریم کی رُو سے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیاں عام تھیں۔ ان کا اولین سرچشمہ جنگ کے قیدی تھے اگرچہ بعد میں ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ قرآن کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق واضح حکم دیدیا کہ انہیں رہا کرنا ہوگا — خواہ فدیہ لے کر خواہ احساناً۔ اس طرح اس نے قیدیوں کے سرچشمہ کو ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔ اب رہے وہ غلام اور لونڈیاں جو اس وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے،

ان کے مسئلہ کا حل وقت چاہتا تھا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے ایسی ہدایات دیں کہ وہ آہستہ آہستہ یا تو آزاد خاندانوں کا جزو بنتے گئے اور یا آزاد ہوتے چلے گئے۔ جو لونڈیاں اس طرح جزوِ خاندان بن جاتی تھیں ان کی حیثیت منکوحہ بیویوں کی سی ہو جاتی تھی۔ قرآن کریم میں، "ازواج" اور "ما ملکت ایمانکم" کی دو الگ الگ قسموں کا بیان بغرض تعارف آیا ہے، اس لئے کہ بعض معاملات میں ان دونوں میں امتیاز رکھا گیا تھا (مثلاً زنا کی سزا کے معاملہ میں) لہٰذا جہاں تک جنسی تعلق کا معاملہ تھا، یہ نکاح ہی سے مشروط تھا، خواہ وہ کنیز کا آزاد مرد سے ہو یا غلام کا آزاد عورت سے۔ یا کنیزوں اور غلاموں کا باہمی تعلق۔ قرآن کریم میں "ما ملکت ایمانکم" سے متعلق جو ہدایات آئی ہیں وہ انہی (سابقہ) غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ "ما ملکت ایمانکم" یا "ما ملکت ایمانھم" ہر جگہ ماضی کے صیغہ میں آئے ہیں۔ یعنی "وہ جو اس سے پہلے تمہاری ملک میں آچکے ہیں"۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ جو اس کے بعد تمہاری ملک میں آئیں ان کے متعلق بھی یہ احکام ہیں۔

جہاں تک ہماری نگاہ کام کر سکی ہے، ظہور اسلام سے پہلے (عرب جاہلیہ میں) کنیزوں کے ساتھ ان کے مالکوں کا جنسی تعلق (بلا نکاح) تو عام تھا، لیکن یہ مثال نہیں ملتی کہ آزاد عورتیں اپنے غلاموں کے ساتھ اس قسم کا تعلق قائم کرتی تھیں۔ (یہ بہرحال جملہ معترضہ ہے۔ یہاں بات ظہور اسلام کے بعد کی ہو رہی ہے)۔

ان سابقہ غلاموں اور لونڈیوں کے ختم ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں غلاموں اور لونڈیوں کا وجود، قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ لہٰذا ان کے سلسلہ میں فقہی احکام (مثلاً یہ کہ لونڈی سے بلا نکاح جنسی تمتع جائز ہے اور غلام سے مالکہ کا جنسی تعلق بلا نکاح جائز نہیں۔ وغیرہ وغیرہ) ایک ایسی صنف سے متعلق ہیں جن کا وجود ہی (اسلامی معاشرہ میں) خلاف قرآن ہے۔

(۳) جناب محمد نیاز صاحب کا یہ کہنا کہ

> اب رہ جاتے ہیں صرف وہ قیدی جو خود ہی اسلامی معاشرہ کا جزو بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ غلامی پر رضامند ہوں کیونکہ ایک اسلامی معاشرہ میں کسی "معاشرہ کفار" کے فرد کو مطلق آزاد کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟

اسلامی نظام معاشرہ کے صحیح تصور سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اگر کوئی جنگی قیدی، اپنے معاشرہ میں واپس نہیں جانا چاہتا تو وہ اسلامی معاشرہ میں ایک قیدی۔ یا غلام (لونڈی) کی حیثیت سے نہیں رہیگا۔

وہ ایک عام آزاد انسان کی حیثیت سے رہے گا۔ اگر وہ بطیب خاطر اسلام قبول کر لیتا ہے تو مسلمانوں کی جماعت کا فرد بن کر۔ اور اگر وہ غیر مسلم رہنا چاہتا ہے تو اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی حیثیت سے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلم بھی تو رہ سکتے ہیں؟ انہیں انسانیت کے بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں

(۴) جناب نیاز (فتحپوری) کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ان آیات میں "تحفظ فروج" سے مراد جنسی عصمت نہیں، بلکہ ستر پوشی ہے۔ یہ خیال، مولانا محمد علی (لاہوری۔ مرحوم) نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن (آیت ۲۴ کی تشریح) میں ظاہر کیا تھا لیکن اپنے اردو ترجمہ میں انہوں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہاں "تحفظ فروج" سے مراد جنسی عصمت ہی لی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ مفہوم ہمیں کہیں نظر نہیں پڑا۔ نہ عربی لغت میں، نہ کسی تفسیر میں۔ خود قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں یہ الفاظ آئے ہیں، وہاں ان سے "ستر پوشی" مراد لینے کا کوئی قرینہ نہیں۔ جناب نیاز (فتحپوری) ان الفاظ کا یہ مفہوم لینے پر جو مجبور ہوئے تو اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف صاحب مضمون نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی جب انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ ان الفاظ کا مفہوم جنسی تعلق" لینے سے یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اس سے آزاد عورتوں کا اپنے غلاموں سے (بلا نکاح) جنسی تعلقات قائم کرنے کا جواز مل جاتا ہے تو انہوں نے اس دشواری سے بچنے کے لئے ان الفاظ کا یہ مفہوم وضع کر لیا۔ اگر ان کے سامنے ملک یمین کا قرآنی تصور ہوتا تو انہیں اس قسم کے کمزور سہارے کی ضرورت نہ پڑتی۔

(۵) صاحب مضمون کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں کہ چونکہ سورۃ المعارج کی زیر نظر آیات میں تمام ضمیریں۔ صیغے۔ اور صلے وغیرہ مذکر کے ہیں، اس لئے ان احکام کے مخاطب صرف مرد ہیں اور ما ملکت ایمانھم سے مراد صرف لونڈیاں ہیں۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کریم کے بیشتر احکام صرف مردوں کے لئے مختص ہو جائیں گے حالانکہ خود ان احکام سے واضح ہے کہ وہ مومن مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہیں۔ زبانوں کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ جہاں مرد اور عورتیں دونوں مخاطب ہوں، وہاں صیغے، ضمائر وغیرہ مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں اور مستثنیات کا ذکر خصوصیت سے کر دیا جاتا ہے، یہی انداز قرآن کریم کا بھی ہے۔ وہ "یا ایھا الذین امنوا" سے تخاطب کرتا ہے اور اس کے بعد جو احکام دیتا ہے وہ مومن مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں ہوتے ہیں، بجز ایسے احکام کے جن کا تعلق خالصتاً مردوں یا عورتوں سے ہو۔ خود سورۃ معارج کی زیر نظر آیات میں بیان کردہ خصوصیات کو دیکھئے۔ کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ خصوصیات صرف مومن مردوں کی ہیں۔ مومن عورتیں ان سے خارج ہیں۔ وہ صفات کیا ہیں

الْمُصَلِّيْنَ - الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ - وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ - لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ - وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ - وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ - (۷۰/۲۲-۳۴)

انہی کے درمیان " وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ " آیا ہے۔ اسی طرح سورۃ المومنون میں جہاں یہی الفاظ اسی انداز سے آئے ہیں' المومنون کی جو صفات بتائی گئی ہیں' وہ سب ایسی ہیں جن میں مرد اور عورتیں دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ - وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ - (۲۳/۲-۹)

لہٰذا یہ توجیہہ تو درست نہیں کہ چونکہ ان آیات میں صیغے اور صلے وغیرہ مذکر کے ہیں اس لئے ان احکام میں عورتیں شامل نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ان احکام میں " مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ " کا تعلق صرف کنیزوں سے ہے یا کنیزوں اور غلاموں دونوں سے تو اس باب میں ہماری بصیرت جس مفہوم کی طرف راہ نمائی کرتی ہے وہ درج ذیل ہے ——

قرآن کریم میں جن مقامات پر " مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (یا ایمانہم) کے الفاظ جنسی تعلقات کے سلسلہ میں آئے ہیں' ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں ان سے مراد لونڈیاں ہی ہیں۔ غلام نہیں۔ مثلاً سورۃ النساء میں منکوحہ عورتوں کی تعداد کے سلسلہ میں اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۳) آیا ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ کے بعد اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۲۴) آیا ہے۔ اسی طرح اس سے اگلی آیت میں الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ کے ساتھ نکاح کے عدم استطاعت کی صورت میں فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۲۵) آیا ہے۔ اور چونکہ ان لونڈیوں کے مومن ہونے کی شرط ضروری تھی اس لئے اس کے بعد مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴/۲۵) کے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے اس کے برعکس جہاں جنسی تعلقات کا ذکر نہیں وہاں عورتوں کے مملوک یا مملوکہ کا ذکر اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ (۲۴/۳۱) کہہ کر کیا گیا ہے (اس مقام پر کہا گیا ہے کہ عورتیں ان کے سامنے

اظہار زینت کر سکتی ہیں) یا جہاں کوئی اور حکم ہے (جس کا تعلق جنسی تعلق سے نہیں) وہاں بھی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ میں لونڈی غلام دونوں شامل ہیں. مثلاً سورۂ نور میں جہاں مکاتبت کے سلسلہ میں یہ الفاظ آئے ہیں تو ان سے مراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں (۲۴/۳۳) اس سے واضح ہے سورۂ معارج (۷۰/۳۰) یا سورۂ مومنون (۲۳/۶) میں جہاں جنسی تعلق کے سلسلہ میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کے الفاظ آئے ہیں، وہاں ان سے مراد وہ لونڈیاں ہیں جو ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرہ میں موجود تھیں اور جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس صورت میں اس حکم کا تعلق صرف مردوں سے ہوگا۔

لیکن اگر ہماری اس توجیہہ کو قابل قبول نہ سمجھا جائے تو پھر سورۂ معارج اور سورۂ مومنون کی متعلقہ آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ

مومن مرد وہ ہیں جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی سے جنسی تعلق قائم نہیں کرتے، بجز اپنی آزاد بیویوں کے یا ان کنیزوں کے جنہیں وہ قرآنی ہدایت کے مطابق، بیوی بنا چکے ہوں۔

اسی طرح مومن عورتیں وہ ہیں جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں اور کسی سے جنسی تعلق قائم نہیں کرتیں، بجز اپنے آزاد خاوندوں کے یا ان غلاموں کے جنہیں وہ قرآنی احکام کے مطابق اپنا خاوند بنا چکی ہوں۔

لہٰذا ان آیات میں

(i) نہ تو "تحفظ فروج" سے مراد ستر پوشی ہے۔

(ii) نہ ہی ان سے اس امر کا جواز ثابت ہوتا ہے کہ مومن عورتیں، اپنے غلاموں سے بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کر سکتی ہیں۔ اور

(iii) نہ ہی ایسا فرض کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ چونکہ ان میں ضمائر۔ صیغے اور صلے مذکر کے استعمال ہوئے ہیں، اس لئے یہ تمام خصوصیات مردوں سے متعلق ہیں، عورتوں سے نہیں۔

اور یہ تمام احکام متعلق ہیں ان غلاموں اور لونڈیوں سے جو ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرہ میں موجود تھے۔

ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ بصیرت افروز پمفلٹس

مختلف اوقات میں ادارہ کی طرف سے جو پمفلٹس شائع ہوتے رہے، مختلف حلقوں کی فرمائش پر ان میں سے بعض اہم پمفلٹ از سر نو شائع کئے گئے ہیں۔ ہر پمفلٹ کی قیمت معہ محصول ڈاک درج ذیل ہے اور حسب ضرورت اس فہرست کے مطابق ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجکر انہیں ادارہ سے منگایا جا سکتا ہے۔

(۱) اسلام میں قانون سازی کا اصول قیمت ۳۰ پیسے (۲) معرکۂ دین و وطن قیمت ۳۰ پیسے
(۳) پاکستان کس نے بنایا " ۳۰ پیسے (۴) قائداعظمؒ کا پاکستان " ۲۵ پیسے
(۵) اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داریاں " ۳۰ پیسے (۶) مومن کسے کہتے ہیں؟ " ۴۰ پیسے
(۷) ہم عیدالفطر کیوں مناتے ہیں؟ " ۲۰ پیسے (۸) پاکستان میں کوئی بھوکا نہ رہے " ۱۶ پیسے
(۹) کیا عائلی قوانین اسلام کے خلاف ہیں؟ " ۳۰ پیسے (۱۰) WOMAN RECREATED ۵۰ پیسے

ان پمفلٹس کے ساتھ حسب ذیل پمفلٹ، بلا قیمت ارسال کئے جائیں گے۔

۱۔ ایسا کیوں ہے؟ ۲۔ عائلی قوانین میں کیا ہے؟
۳۔ طلوع اسلام کا مسلک ۴۔ خاندانی منصوبہ بندی۔
۵۔ الزامات

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵/بی گلبرگ ۲ — لاہور

مقامِ حدیث

پہلے یہ کتاب، دو جلدوں میں چھپی تھی اور ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ اب اسے نظرثانی کے بعد ایک ہی جلد میں شائع کیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب میں

بتایا گیا ہے کہ احادیث کس طرح مرتب ہوئیں۔ ان کے جامعین کون ہیں؟ مختلف مجموعوں میں کس قسم کی احادیث ہیں۔ حدیث اور قرآن کا باہمی تعلق کیا ہے۔ دین میں حدیث کا صحیح مقام کیا ہے۔

اس ایک کتاب کے مطالعہ سے

آپ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے اور اس اہم سوال سے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوں گی۔ قیمت فی جلد — چار روپے۔

۲۔ اگر آپ پیشگی خریدار ہیں لیکن یہ کتاب نہیں منگانا چاہتے تو پندرہ اکتوبر تک ہمیں اطلاع بھیجدیجئے۔ اطلاع نہ ملنے کی صورت میں آپ کو کتاب بھیجدی جائے گی۔

۳۔ اگر آپ پیشگی خریدار نہیں، تو آپ سوا چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ آپ کو کتاب گھر بیٹھے مل جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

طلوع اسلام کنونشن

کے متعلق طے پایا تھا کہ وہ وسط اکتوبر میں منعقد ہوگی۔ لیکن ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اس کا ملتوی کیا جانا مناسب ہے۔ حالات کے سازگار ہونے پر اس کا انعقاد عمل میں آئیگا۔ اگر اس کے لئے اکتوبر ہی کی کوئی اور تاریخیں مقرر کی گئیں تو اس کی بابت بزموں کو فرداً فرداً اطلاع دی جائے گی۔ اگر یہ تاریخیں اکتوبر کے بعد کی ہوئیں تو نومبر کے رسالہ میں اس کی بابت اعلان کر دیا جائے گا۔ بہرحال یہ التوا زیادہ وقت تک کے لئے نہیں ہوگا۔ اس لئے بزمیں اس کی تیاری میں مصروف رہیں اور ادارہ نے جو رپورٹ بزموں سے مانگی ہے اسے ۷ر اکتوبر تک بالضرور بھیجدیں۔

والسلام

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔

تین اہم کتابیں

۱۔ اسلام کیا ہے؟ قیمت اعلیٰ ایڈیشن آٹھ روپے۔
سستا ایڈیشن چار روپے۔

۲۔ سلسبیل۔ قیمت۔ آٹھ روپے

۳۔ بہار نو۔ (سستا ایڈیشن) قیمت۔ پانچ روپے

ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/ بی گلبرگ
لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے۔ دوسری و تیسری جلد (چھ روپے فی جلد)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اسکی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے اُبھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے)
(حیپ ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام — ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور